زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہ نامہ اشراق

جنوری 2024ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

جلد ۲ شمارہ ۱ جنوری ۲۰۲۴ء جمادی الثانی ۱۴۴۵ھ

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

حصول جنت کے لیے اللہ کا مقررہ طریقہ: تزکیۂ نفس — سید منظور الحسن — 3

عدت میں نکاح: جناب جاوید احمد غامدی کا موقف — محمد حسن الیاس — 12

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 83-98 (5) — جاوید احمد غامدی — 19

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 23

مقامات

می باقی — جاوید احمد غامدی — 24

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (6) — سید منظور الحسن — 27

نقد و نظر

گمانوں کے لشکر — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 33

نقطۂ نظر

قدیم مفسرین کے تسامحات اور مولانا فراہیؒ (1) — ابو سعد اعظمی — 38

مختارات

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت (1) — امین احسن اصلاحی — 46

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی (1) — سید ابو الحسن علی ندوی — 55

سیر و سوانح

حیاتِ امین (5) — نعیم احمد بلوچ — 63

ادبیات

ہم سفر — جاوید احمد غامدی — 77

صبحِ درخشاں (بچوں کے لیے)

مسلمان کے چھ حقوق (منظوم حدیث) — سید منظور الحسن — 79

حالات و وقائع

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 82

سید منظور الحسن

حصول جنت کے لیے اللہ کا مقررہ طریقہ: تزکیۂ نفس

انسان کا نصب العین دار الآخرت ہے۔ یہ امن و سلامتی کا جہان اور ابد الآباد کی بادشاہی ہے۔ قرآنِ مجید نے اِسے ”جنت“ سے موسوم کیا ہے اور اِس کے لیے ’جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ، جَنَّاتِ النَّعِیمِ، جَنَّاتِ عَدْنٍ، جَنَّاتٍ تَجْرِی مِن تَحْتِهَا الاَنْهَارُ‘ اور اِس طرح کی متعدد تعبیرات اختیار کی ہیں۔ فرمایا ہے کہ یہ فردوس کے باغ،[1] راحت کے گلستان[2] اور ابد کے چمن زار ہیں۔[3] اِن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔[4] اِن میں نہ دھوپ کی حدت ہے، نہ سردی کی شدت۔[5] اِن میں رہنے کے لیے پاکیزہ مکان ہیں۔[6] یہ بہترین سکونت گاہ ہے۔[7] اِس کی راحت دائمی ہے۔[8] لوگ اِس میں سونے کے

---

[1]۔ سورۂ کہف 107:18۔

[2]۔ سورۂ یونس 9:10۔

[3]۔ سورۂ توبہ 72:9۔

[4]۔ سورۂ نسا 57:4۔

[5]۔ سورۂ دہر 13:76۔

[6]۔ سورۂ توبہ 72:9۔

[7]۔ سورۂ فرقان 75:25۔

[8]۔ سورۂ توبہ 21:9۔

کنگن اور موتیوں کے ہار پہنے اور سندس و استبرق اور ریشم کی پوشاک زیب تن کیے مسند آرا ہوں گے۔[9] اُن کے کھانے کے لیے قسم قسم کے میوے ہوں گے، جو مانگیں گے، حاضر کر دیا جائے گا۔[10] اِس میں بندوں کو اپنے پروردگار کا قرب حاصل ہو گا اور اُن کا مالک اُنھیں خود شرابِ طہور کے جام پلائے گا۔[11] چنانچہ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کی یہ ''جنت'' خیر و عافیت کی سرزمین، راحت و تسکین کی سلطنت اور 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی بادشاہی ہے۔ دنیا کی زندگی اِس کے مقابلے میں ادنیٰ اور کم ترین ہے، یہ اُس سے بلند و برتر اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے اِس کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ عیش دوام کی جگہ ہے۔ اِس حیات دنیوی کے برخلاف اِس میں زندگی کے ساتھ موت، لذت کے ساتھ الم، خوشی کے ساتھ غم، اطمینان کے ساتھ اضطراب، راحت کے ساتھ تکلیف اور نعمت کے ساتھ نقمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اِس کا آرام دائمی ہے، اِس کی لذت بے انتہا ہے، اِس کے شب و روز جاوداں ہیں، اِس کی سلامتی ابدی ہے، اِس کی مسرت غیر فانی ہے، اِس کا جمال لازوال اور کمال بے نہایت ہے۔'' (میزان 197)

انسان اِسی جنت کو پانے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ نے اُسے ہدایت کی ہے کہ وہ زندگی بھر اِسے پانے کی جدوجہد میں سرگرم رہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ. (آل عمران 3:133)	''اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف بڑھ جانے کے لیے دوڑو، جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اُن پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

دوسرے مقام پر اِس کے حصول کی جدوجہد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی

---

[9]۔ سورۂ کہف 31:18۔ سورۂ حج 23:22۔

[10]۔ سورۂ یٰسین 57:36۔

[11]۔ سورۂ دہر 21:76۔

ترغیب فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (الحدید 21:57)

”(اِس لیے) دوڑو اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے۔ اُن لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہے گا، عطا فرمائے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

اللہ کا دین اِسی جنت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اُس کی کتابیں اِسی کے راستوں کا پتا دیتی ہیں اور اُس کے پیغمبر اِسی کو پانے کے لیے انسان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا اور اُن کی ذریت کو امتحان کے لیے زمین میں آباد ہونے کا حکم دیا تو اُس موقع پر یہ وعدہ کیا کہ وہ انسانوں پر اپنی رحمت فرمائے گا اور اُن کے لیے دین کی صورت میں اپنی ہدایت کا سامان کرے گا۔ جو لوگ اُس ہدایت کی قدر کریں گے اور اُس پر عمل پیرا ہوں گے، وہی اُس جنت کے مستحق قرار پائیں گے، جہاں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم ہو گا۔ فرمایا ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرہ 38:2)

”ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو اُسی پر چلنا، اِس لیے کہ جو لوگ میری اِس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کا صلہ جنت ہے، سو اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔“

اس مقام کی وضاحت میں استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

”اِس سے واضح ہوا کہ انسان کا نصب العین ازل ہی سے جنت الفردوس ہے۔ وہ اِسی کو پانے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے، لہٰذا اُس کے تمام اعمال کا محرک یہی جنت ہے۔ وہ اگر اِس کی اصلی جگہ پر اِس کے حصول کی جدوجہد نہ بھی کر رہا ہو تو اِس سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ اپنے علم و عمل کی تمام صلاحیتیں وہ پھر اِسی دنیا میں اِسے پا لینے کی جدوجہد میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ چیز اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اِسی نصب العین کے لیے جیتا اور اِسی کے لیے مرتا ہے۔“ (البیان 1/ 54)

جنت الفردوس کے اِس نصب العین کو پانے کے لیے اللہ کا مقرر کردہ طریقہ تزکیۂ نفس ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ بہشتِ بریں کے دروازے اُنھی لوگوں کے لیے کھلیں گے، جو اپنے ظاہر و باطن کو ہر لحاظ سے پاکیزہ بنانے کی کوشش کریں گے۔

ارشاد فرمایا ہے:

وَ مَنۡ یَّاۡتِہٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَہُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی. جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی. (طٰہٰ 20: 75-76)

”جو مومن ہو کر اُس کے حضور آئیں گے، جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں، جن کے لیے اونچے درجے ہیں۔ ہمیشہ رہنے والے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اُن کا جو پاکیزگی اختیار کریں۔“

امام امین احسن اصلاحی اِس مقام کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”یہ صلہ ہے اُن لوگوں کا جو اپنے ظاہر و باطن اور اپنے عقیدہ و عمل کو پاکیزہ بنائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹی تمناؤں سے ملنے والی چیز نہیں ہے، بلکہ اِس کے حق دار وہی ٹھہریں گے، جو اِس کے حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو ہر قسم کی آلایشوں سے، خواہ وہ فکری و نظری ہوں یا عملی و اخلاقی، پاک کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ اِس راہ میں آدمی کو جو ٹھوکریں لگتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کے تدارک کی تدبیریں بھی اپنی اِس کتاب میں بتا دی ہیں اور انسان اپنی کم زوریوں

کی وجہ سے جن رعایتوں کا محتاج ہے، وہ بھی اُس کو بخشی گئی ہیں۔“(تدبر قرآن 5/ 69)

سورۂ نازعات (79) میں اِسی حقیقت کو دوسرے اسلوب میں واضح کیا ہے۔ فرمایا ہے کہ جنت اُن لوگوں کو ملے گی، جو اپنے نفس کو باطل خواہشوں کی پیروی کرنے سے روکیں گے:

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى.(40-41)

”اور جو اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو بہشت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔“

اِس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ انسان کا مقصدِ حیات جنت الفردوس کا حصول ہے۔ اُس کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس کو پاکیزہ بنائے۔ اللہ کے پیغمبر انسان کو اُس طریقے کی تعلیم دیتے ہیں، جس کو اختیار کر کے انسان اپنے نفس کو پاکیزہ بنا سکتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے اِسی طریقے کا نام دین ہے۔ چنانچہ دین کا مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ یعنی اُس کا وظیفہ یہ ہے کہ لوگوں کو پاکیزگی اختیار کرنے کے طریقوں سے آگاہ کیا جائے۔

استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

”اِس دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح میں ”تزکیہ“ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلایشوں سے پاک کر کے اُس کے فکرو عمل کو صحیح سمت میں نشوونما دی جائے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کا نصب العین بہشت بریں اور ’رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً‘ کی بادشاہی ہے اور فوزوفلاح کے اِس مقام تک پہنچنے کی ضمانت اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اِس دنیا میں اپنا تزکیہ کر لیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى. بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى.

(الاعلیٰ 87: 14-17)

”البتہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اِس کے لیے اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (لوگو، تم کوئی حجت نہیں پاتے)، بلکہ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دراں حالیکہ آخرت اُس سے بہتر بھی ہے اور پایدار بھی۔“

لہٰذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تزکیہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کے نبی اِسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے اور سارا دین اِسی مقصود کو پانے اور اِسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ، یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. (الجمعہ 2:62)

”اُسی نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھی میں سے اٹھایا ہے، جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اِس کے لیے اُنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“ (میزان 80)

چنانچہ جو شخص اپنے نفس کو پاکیزہ کر لیتا، یعنی اُسے فکر و عمل اور روح و بدن کی آلایشوں سے صاف کر لیتا ہے، وہ اللہ کے نزدیک ایک نفس مطمئن ہے، اور وہی ہے، جسے ’راضیۃً مرضیۃً‘ کی بادشاہی میں داخل ہونے کا اذن دیا جائے گا۔ ارشاد ہو گا:

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. (الفجر 89:27-30)

”اے نفس مطمئن، اپنے رب کی طرف لوٹ، اِس حال میں کہ تو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو۔“

’اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً‘ کے کلماتِ اذن کے بارے میں امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

”(یہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین کا کلمہ ہے۔ اُن لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد ہو گا کہ شاباش! تمھارے رب نے جس میدان امتحان میں تمھیں اتارا، اُس میں تمھاری بازی نہایت کامیاب رہی۔ اب تم اپنے رب کی طرف اِس سرخ روئی کے ساتھ لوٹو کہ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ہر طرح کے نرم و گرم حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے اور ساتھ ہی تمھیں یہ سرفرازی بھی حاصل ہوئی کہ تم اپنے رب کی نظروں میں بھی پسندیدہ ٹھہرے۔ جس طرح تم اپنے رب سے کسی مرحلے میں گلہ مند نہیں ہوئے، اُسی طرح تمھارے رب نے تم کو

بھی کسی مرحلے میں اپنے معیار سے فروتر نہیں پایا۔ تم اُس سے راضی، وہ تم سے راضی!‘‘

(تدبر قرآن 9/362)

اِس سے واضح ہے کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو دین پیش کیا ہے، وہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت ہے۔

تزکیۂ نفس کی بنیاد خیر و شر کا شعور ہے، جو انسان کے وجود کا لازمی حصہ ہے۔ جس طرح انسان کو خلقی طور پر توالد و تناسل، سمع و بصر، نطق و کلام، فہم و ادراک اور عقل و دانش کی صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں، اُسی طرح خیر و شر کا شعور بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ شعور اُس کی فطرت میں الہام ہے۔ چنانچہ وہ بغیر کسی خارجی رہنمائی کے نیکی اور بدی کو پہچاننے اور اُن میں امتیاز کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ گویا یہ ایک حاسۂ اخلاقی ہے، جس کی بدولت وہ اچھے اور برے اخلاق میں تفریق کر سکتا اور یہ جان سکتا ہے کہ اُن میں سے کون سے اجزا اُس کی شخصیت کے لیے مفید اور کون سے ضرر رساں ہیں۔ اِس فطری شعور اور اِس حاسۂ اخلاقی کے لیے قرآن مجید نے ’اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتُقْوٰهَا‘ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتُقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا.

(الشمس 91: 7-10)

’’اور نفس اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی بدی اور نیکی اُسے سجھادی کہ (روزِ قیامت شدنی ہے، اِس لیے) فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اُسے آلودہ کر ڈالا۔‘‘

استاذِ گرامی اِس مقام کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اُسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر یہی حقیقت ’اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ‘ (ہم نے اُسے خیر و شر کی راہ سجھادی) اور ’هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ‘ (ہم نے کیا

اُسے دونوں راستے نہیں سجھائے) کے الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالم گیر حقیقت ہے۔ چنانچہ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اُسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دینے کے بعد اُس کی لاش چھپانے کی کوشش کی تھی تو ظاہر ہے کہ احساس گناہ کی وجہ سے کی تھی۔ یہی معاملہ نیکی کا ہے۔ انسان اُس سے محبت کرتا ہے، اُس کے لیے اپنے اندر عزت و احترام کے جذبات پاتا ہے اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے، اُس میں حق و انصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اِس امتیاز خیر و شر کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ برائی کے حق میں انسان بعض اوقات بہانے بھی تراش لیتا ہے، لیکن جس وقت تراشتا ہے، اُسی وقت جانتا ہے کہ یہ بہانے وہ اپنی فطرت کے خلاف تراش رہا ہے، اِس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اُس کے ساتھ کر بیٹھے تو بغیر کسی تردد کے وہ اُسے برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔" (البیان 5 / 465-466)

خیر و شر کا یہی شعور انسان کو تزکیۂ نفس پر آمادہ کرتا ہے۔ اِس کی بنا پر اُسے یقین ہوتا ہے کہ نیکی اور بدی اپنی حقیقت اور اپنے ظاہر و باطن میں یکساں نہیں ہیں، لہٰذا اِن کے نتائج بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق اِس امر کا متقاضی ہے کہ اِن کا صلہ بھی ملنا چاہیے اور یہ صلہ یکساں نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ جان لیتا ہے کہ وہ مطلق العنان اور مختارِ کل نہیں، بلکہ کچھ حدود و قیود کا پابند ہے۔ وہ اگر حدود کی پاس داری کرے گا تو فلاح پائے گا اور اگر اُنھیں قطع کرے گا تو نامراد ہو گا۔ استاذِ گرامی نے سورۂ شمس کی مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں اِس امر کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ اصل محرک کیا ہے جو انسان کو تزکیۂ اخلاق پر آمادہ کرتا ہے؟ اِس سوال کا جواب قرآن نے اِن آیتوں میں یہ دیا ہے کہ وہ محرک اِسی الہام خیر و شر کی بنا پر انسان کا یہ احساس ہے کہ اِن دونوں کے نتائج اُس کے لیے یکساں نہیں ہو سکتے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا شعور اپنے وجود ہی سے اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اِن دونوں کا نتیجہ بھی اِنھی کے لحاظ سے سامنے آئے۔ اِس سے یہ حقیقت اُس پر واضح ہوتی ہے کہ وہ کوئی شتر بے مہار نہیں ہے اور اپنے اعمال کے صلے میں اُسے لازماً جزا و سزا سے دوچار ہونا ہے۔

قرآن نے اِسی کو یہاں مراد کو پہنچنے اور نامراد ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ خوف و طمع کا ایک احساس انسان کے اندر پیدا ہوتا اور اِس بات کا محرک بن جاتا ہے کہ اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم وہ اپنے اخلاق کو پاکیزہ بنائے۔ پھر جب وہ ایمان لے آتا ہے تو یہی احساس خدا سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اُس وقت قرآن اُس سے مطالبہ کرتا ہے کہ اچھے اخلاق کی پابندی اور برے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک اب صرف اُس خدا کی محبت، اُس کی رضا کی طلب اور اُس کی ناراضی کا خوف ہونا چاہیے جو عالم الغیب ہے، دانائے راز ہے، واقف اسرار ہے اور وجود کی ہر حرکت اور قلب و نظر کی ہر جنبش سے پوری طرح باخبر ہے۔''

(میزان 204)

محمد حسن الیاس

عدت میں نکاح: جناب جاوید احمد غامدی کا موقف

شریعت کی اصطلاح میں 'عدت' سے مراد وہ مدت ہے، جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اُس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت اِس لیے مقرر کی ہے کہ عورت کے پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے اور بچے کے نسب کا معاملہ مشتبہ نہ رہے۔

طلاق کی صورت میں یہ مدت تین حیض ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

''اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔ اور اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُن کے پیٹ میں پیدا کیا ہے، اُسے چھپائیں۔'' (228:2)

بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ فرمایا ہے:

''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' (البقرۃ 234:2)

یہ اضافہ اِس لیے ہوا ہے کہ مطلقہ کو تو ایسے طہر میں طلاق دینے کی ہدایت ہے، جس میں زن و شو کا تعلق قائم نہ ہوا ہو، مگر شوہر کی وفات کی صورت میں چونکہ یہ ضابطہ بنانا ممکن نہیں ہے، لہٰذا احتیاطاً بیوہ کی عدت مطلقہ کے مقابلے میں ایک ماہ دس دن زیادہ مقرر کی ہے۔

عورت اگر حیض سے مایوس ہو چکی ہو یا حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود اسے حیض نہ آئے تو اُس

کی عدت تین ماہ ہے۔ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ جہاں تک اُس عورت کا معاملہ ہے، جس سے نکاح کے بعد زن و شو کا تعلق قائم نہیں ہوا تو اُس کے لیے عدت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

”ایمان والو، (اِس لیے کہ) جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرتے ہو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے اُن کو طلاق دے دیتے ہو تو اُن پر تمھاری خاطر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تم شمار کرو گے۔“ (الاحزاب 49:33)

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ عدت کا سبب استبراے رحم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاملہ کی عدت بچے کی ولادت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اور ایسی منکوحہ جس کی رخصتی نہ ہوئی ہو، اُس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔

عدت کے بارے میں یہ قرآنِ مجید کے احکام ہیں۔ اِن کی نوعیت اللہ کی ابدی شریعت کی ہے، جس کی تعمیل لازم ہے۔ اِن سے انحراف احکام الٰہی کی خلاف ورزی کے مترادف ہے اور عند اللہ مستوجب سزا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اِن کی پابندی کرنی چاہیے اور اِن سے روگردانی کی راہ نہیں ڈھونڈنی چاہیے۔

اِن کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہے کہ اِن کی خلاف ورزی کے معاملات میں شریعت نے خاموشی اختیار کی ہے۔ جب کہ انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بعض اوقات غفلت اور کم علمی کے باعث یا غصے، اشتعال اور ردِ عمل میں آکر حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور عدت کے دوران میں نکاح کا اقدام کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کے حکم کی خلاف ورزی پر مبنی ایسے نکاح کی قانونی حیثیت کیا ہو گی اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عملی مسائل سے کیسے نمٹا جائے گا؟

کیا ایسے نکاح کو کالعدم قرار دیا جائے گا؟ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو پھر عدت کی تکمیل کی کیا صورت ہو گی؟ حمل کی صورت میں بچے کے نسب کا کیسے تعین ہو گا؟ نگہداشت کے معاملات کس کی ذمہ داری ہوں گے؟

کیا ایسے نکاح کو جائز قرار دیا جائے گا؟ اِس صورت میں خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے کیا کوئی سزا مقرر کی جائے گی؟ اگر عورت حاملہ ہو گی تو اُس کے حمل کو سابقہ شوہر سے منسوب سمجھا

جائے گا یا نئے شوہر سے؟

یہ اور اِس نوعیت کے متعدد سوالات اکثر و بیش تر سامنے آتے ہیں۔ اِن کے حل کے لیے مسلمانوں کے علما اور محققین اپنے علم و فہم کے مطابق دین کی اصولی رہنمائی میں آرا پیش کرتے ہیں۔ لوگ اُن میں سے جن پر مطمئن ہوں، اُنھیں اپنی صواب دید سے اختیار کر لیتے ہیں۔ حکومتیں بھی اُن میں سے بعض کا انتخاب کر کے اُنھیں ملکی قانون کی صورت دے دیتی ہیں۔ شریعت کے کسی اطلاقی مسئلے میں اگر قرآن و سنت خاموش ہوں تو دین کے منشا تک پہنچنے کے لیے یہی طریقہ مسلم ہے۔ اِسی کو اصطلاح میں اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے جلیل القدر فقہا کا بیش تر کام اِسی دائرے سے متعلق ہے۔

مذکورہ مسئلے میں فقہاے احناف کی اجتہادی راے یہ ہے کہ عدت کے دوران میں کیے گئے نکاح کے بعد اگر زن و شو کا تعلق قائم نہ ہو تو نکاح کو باطل سمجھا جائے گا گویا نکاح منعقد ہی نہیں ہوا۔ زن و شو کا تعلق قائم ہو گیا ہو تو نکاح باطل نہیں، بلکہ فاسد قرار پائے گا۔ یعنی نکاح کو منعقد مان کر علیحدگی کرا دی جائے گی۔ اس صورت میں زن و شو کے تعلق کے باعث، شوہر پر مہر بھی واجب ہو گا۔ استبراے رحم کے لیے عدت گزارنا ضروری ہو گا اور اس دوران میں نان و نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہو گی۔

استادِ مکرم جناب جاوید احمد غامدی کا موقف یہ ہے کہ عدت کے دوران میں نکاح کرنا اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے، لہٰذا یہ صریح گناہ ہے اور اِس کا مرتکب قیامت میں جواب دہ ہو گا۔ چنانچہ اِس کا ارتکاب کرنے والوں کو نادم ہونا چاہیے اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ معاشرے کو ایسی روایات قائم کرنی چاہییں، جو لوگوں میں اِس طرح کی خلاف ورزیوں کی حوصلہ شکنی کریں۔ مقصد یہ ہے کہ شرعی قانون کی حرمت کسی حال میں پامال نہ ہو۔ اُس کی شان پوری طرح قائم رہے اور لوگوں کو احساس ہو کہ ایسی خلاف ورزی کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ صریح جرم ہے۔

جہاں تک اِس نکاح کے قانونی پہلو کا تعلق ہے تو اِسے منعقد سمجھنا چاہیے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گزرے ہوئے وقت میں کیا گیا ایک عملی اقدام ہے، جو امرِ واقعی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ نہ اِسے لوٹایا جا سکتا ہے اور نہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

ایسے نکاح کے نتیجے میں نزاعات کا پیدا ہو جانا بالکل بدیہی ہے۔ اِن میں بہتر یہ ہے کہ اگر خلاف ورزی کا معاملہ خاندانوں میں محدود ہے تو اُسے خاندانی سطح ہی پر حل کرنا چاہیے۔ عدالت میں لے جانے سے گریز کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کی حیثیتِ عرفی مجروح ہونے سے محفوظ رہے۔ اِس مقصد کے لیے خاندان کے بزرگ اور معتبر افراد اپنا کردار ادا کریں اور علما و فقہا کی آرا میں سے جس پر اطمینان ہو، اُسے اختیار کر لیں۔ اِس موقع پر ضروری ہے کہ مسئلے کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے۔ یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ عدت کے دوران میں نکاح کرنے والی کی عمر کیا ہے، عدت مکمل ہونے میں کتنا عرصہ باقی تھا کہ نکاح کر لیا گیا، کیا سابقہ شوہر کے گھر میں عدت گزارنے میں کوئی مشکل تو درپیش نہیں تھی، پھر معاملہ جب فیصلے کے لیے آیا ہے تو نکاح کو کتنا عرصہ بیت گیا ہے، اِس دوران میں زن و شو کا تعلق قائم ہوا ہے یا نہیں ہوا، اگر پہلے شوہر سے اولاد ہے تو اُس کی کیا نوعیت ہے، منکوحہ کو خلاف ورزی کی سنگینی کا کتنا احساس ہے؟ یہ اور اِس طرح کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور دین و شریعت اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

اِس کے برعکس اگر کوئی فریق معاملے کو عدالت میں لے گیا ہے تو پھر تمام تر اختیار عدالت کے پاس چلا جائے گا۔ اِس موقع پر عدالت ملکی قانون کو دیکھے گی۔ اگر کسی فقہی راے کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے تو پھر عدالت کو اُسی کے مطابق فیصلہ دینا ہو گا۔ لیکن اگر وہ کسی فقہ کی پابند نہیں ہے تو تمام حالات کا جائزہ لے کر خود بھی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے یا اپنی صواب دید سے کسی فقہی راے کو بھی نافذ کر سکتی ہے۔

گذشتہ برس ایک نشست میں، راقم نے یہی سوال استاذ گرامی سے پوچھا تو اُنھوں نے جو راے اجمال سے پیش کی اُس پر ایک فاضل محقق نے چند اعتراضات اٹھائے ہیں۔ اب ہم یہاں وہ اعتراضات نقل کر کے اُس پر اپنی گزارشات پیش کریں گے:

وہ لکھتے ہیں:

> ”غامدی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عدت کے دوران میں نکاح کی ممانعت کے متعلق کوئی خاص شرعی حکم نہیں ہے... پھر ’یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ‘ کا مفہوم کیا ہے؟ کیا غامدی صاحب نے اِس پر غور کیا ہے کہ اگر عدت کے دوران میں خاتون کو کسی اور مرد سے نکاح کی اجازت دی

جائے تو کتنی نصوص بالکل بے معنی ہو جاتی ہیں؟''

اِس پر عرض ہے کہ فاضل محقق کو غامدی صاحب کا موقف سمجھنے میں آخری درجے کا تسامح ہوا ہے۔ اِس ضمن میں غامدی صاحب کا موقف جاننے کے لیے عدت کا قانون اور اُس کی تمام تفصیلات اُن کی کتاب ''میزان'' میں میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ زیر بحث گفتگو میں بھی اُنھوں نے یہ بات ہر گز نہیں کہی کہ عدت کے دوران میں نکاح شریعت میں ممنوع نہیں، بلکہ اُنھوں نے تو اِسے بڑی خلاف ورزی اور گناہ کا عمل قرار دیا ہے۔ غامدی صاحب سے دراصل اِس کی خلاف ورزی کی صورت میں ازالے پر سوال کیا گیا تھا، اِس پر اُنھوں نے اُس خلاف ورزی کے بعد کے معاملے پر حکم لگانے کو اجتہادی معاملہ قرار دیا تھا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی عالم بیان کرے کہ زندگی بھر کی نمازوں کی قضا ادا کرنے کا کوئی طریقہ شریعت میں مقرر نہیں کیا گیا اور اِس بات سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ اُس عالم کے نزدیک نماز قضا کرنا کوئی جرم ہی نہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب کی نسبت سے یہ کہنا سر تا سر غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اِس کے بعد فاضل محقق احناف کے ہاں عدت کے دوران میں نکاح پر مختلف احکام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غامدی صاحب نے کہا کہ احناف ایسے نکاح کو باطل، جب کہ دیگر فقہا اسے فاسد کہتے ہیں ... غامدی صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ دیگر فقہا کی بہ نسبت احناف کے ہاں اس معاملے میں سختی زیادہ پائی جاتی ہے، جب کہ حقیقت میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔''

اِس پر گزارش ہے کہ غامدی صاحب اپنی عمومی گفتگوؤں میں فقہی مواقف کی تفصیل بیان نہیں کرتے، بلکہ زیر بحث سوال پر اپنا موقف سامنے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اُنھوں نے راقم کی اِس بات پر کہ عموماً ایسے نکاح کو فاسد کہا جاتا ہے، تصحیح کرتے ہوئے بتایا کہ فقہا اِسے عموماً فاسد نہیں، بلکہ باطل قرار دیتے ہیں۔ فقہاء احناف کے ہاں باطل قرار دیے جانے کے کیا حدود و شرائط ہیں، اُن سے یہ پوچھا گیا تھا اور نہ اُس وقت زیر بحث تھا۔ چنانچہ اِس موقع پر اُن کے پیش نظر ہی نہیں تھا کہ وہ دیگر فقہا کا کوئی مذہب بیان کریں اور احناف کو اُن کے مقابل میں رکھ کر کوئی تبصرہ کریں کہ اُن کا موقف اِس باب میں دوسروں سے زیادہ سخت ہے۔ غامدی

صاحب نے صرف اس بات کی وضاحت کر دی کہ فقہا اسے بالعموم باطل سمجھتے ہیں۔

اِس کے بعد فاضل محقق غامدی صاحب کی اِس بات پر تنقید کرتے ہیں کہ اگر معاملہ انفرادی نوعیت کا ہے تو خاندان کی سطح پر ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”اگر کسی نے خنزیر کا گوشت فروخت کیا، تو یہ عقد باطل ہے کیونکہ خنزیر کا گوشت مال ہی نہیں ہے جسے بیچا جا سکے۔ اسی طرح عدت کے دوران میں نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتا کیونکہ شریعت نے اِس سے روکا ہے اور اِس وجہ سے عدت گزرنے کے بعد نیا نکاح کرنا لازم ہو جاتا ہے...۔“

یہاں فاضل محقق نے غامدی صاحب کی اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ نکاح قائم رکھتے ہوئے اس غلطی کے ازالے کا کوئی امکان سرے سے موجود ہی نہیں! اپنے اِس دعوے کی تائید میں اُنھوں نے مثال پیش کی ہے کہ سؤر کی بیع منعقد ہی نہیں ہو سکتی، اِس لیے کہ فقہا کی نظر میں وہ مال ہی نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قیاس مع الفارق ہے۔ کسی مبیع کی واپسی اور نکاح کے ذریعے سے پیدا ہونے والی انسانی رشتوں کی حرمتوں کو یکسر معاشرے کی سطح پر کالعدم قرار دے دینا، اِن دونوں صورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر عدت کے دوران میں نکاح سرے سے ہی باطل ہے تو پھر فقہا کے اُن تمام فیصلوں کی کیا بنیاد ہے جو زن و شو کے تعلق کے بعد عدت کا لزوم، عدت کے دوران میں نان و نفقہ کی ذمے داری اور اولاد کی صورت میں نسب کا ثبوت مان رہے ہیں۔ اگر ایک معاملہ اپنی کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا تو یہ سب کس اصول پر ہو رہا ہے؟ چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ صورت حال کی رعایت سے فقہا بھی اس باب میں مختلف ہدایات دے رہے ہیں۔ یہی چیز اس معاملے کو اجتہادی بناتی ہے۔

غامدی صاحب بھی اسی اصول پر ازالے کے چند امکانات تجویز کر رہے تھے، چونکہ اِس باب میں ازالے کی کوئی متعین شکل پر قرآن و سنت نے ہمیں پابند نہیں کیا، اِس لیے غامدی صاحب نے عدت میں نکاح کے اِسی گناہ کی شناعت کے باعث یہ بیان کیا کہ اُنھیں چاہیے کہ وہ توبہ کریں اور اُس غلطی کا ازالہ کریں، حقیقت میں وہ زنا کے تعلق میں نہیں، لہٰذا وہ اِس غلطی کو ظاہر میں بھی درست کر لیں اور عدت کے بعد صحیح وقت پر ایک مرتبہ پھر سے ایجاب و قبول کر لیں، اِس کے ساتھ ساتھ غامدی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ عدالتیں اس معاملے میں اس کے علاوہ کوئی حکم دینا

چاہیں تو دے سکتی ہیں۔ کیونکہ ازالے کا معاملہ اور طریقۂ کار اصلاً ''اجتہاد'' پر مبنی ہے، منصوص نہیں ہے۔ لہٰذا اب اعتراض اور نقد کا دائرۂ اجتہادی اطلاق کی صحت پر ہو گا۔ یہی اجتہادی اطلاق ہے جو ہمارے فقہا بھی کر رہے ہیں۔

اس کے بعد فاضل محقق راقم کے ایک تبصرے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چونکہ قانوناً یہ عقد غلط ہوا ہے، اس لیے مرد اور عورت کو باقاعدہ میاں بیوی نہیں قرار دیا جا سکتا اور ان میں تفریق لازم ہے، لیکن اِس تفریق کو ''فسخ'' نہیں کہیں گے۔ حسن الیاس صاحب نے اسے فسخ کہا اور غامدی صاحب بھی اِس پر تبصرہ کیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ یہ فسخ نہیں، بلکہ تفریق ہے۔... کیونکہ قانوناً تو اس تعلق کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہ ایک nullity ہے۔''

یہاں راقم کی اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ جب غامدی صاحب نے بیان کیا کہ فقہا تو نکاح کو باطل قرار دیتے ہیں تو اِس پر میں نے عرض کیا: یعنی ''نکاح کو فسخ کر دیتے ہیں''، فاضل محقق کا کہنا ہے کہ یہاں فسخ کے لفظ کا استعمال درست نہیں، بلکہ تفریق کہنا چاہیے، اِس لیے کہ فسخ کا مطلب ہو گا کہ نکاح تو تسلیم کر لیا گیا ہے جب کہ فقہا کے نزدیک تو نکاح ہوا ہی نہیں، لہٰذا کوئی بھی فریق بغیر طلاق کے الگ ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات دو وجوہ سے درست نہیں۔ پہلی یہ کہ فقہا بعض صورتوں میں، مثلاً: زن و شو کا تعلق قائم ہو گیا ہو یا حمل ٹھیر جائے یا اولاد کی موجودگی پر عدت گزارنے کو لازم قرار دیتے، اولاد کا نسب ثابت مانتے اور اُس رشتے کو زنا بھی قرار نہیں دیتے۔ اور مرد پر ایسے نکاح کے خاتمے پر عدت کے دوران میں نان و نفقہ کی ذمے داری بھی ڈالتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے الفاظ میں: ''قانوناً تو اِس تعلق کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور یہ ایک nullity ہے۔ تو پھر یہ سب کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ گویا فقہا بھی اِس رشتے کو حکماً قانونی مان کر ہی علیحدگی کروا رہے ہیں، چنانچہ حقیقتاً یہ فسخ نکاح ہی ہے۔ فسخ نکاح کا مطلب ہوتا ہے: رشتۂ نکاح کو توڑ دینا، ختم کر دینا۔ اس صورتحال میں یہی ہو رہا ہے۔ تاہم فاضل محقق کو زیادہ موزوں ''تفریق'' کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے، تو وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(5)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۠ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور یاد کرو، جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور والدین کے ساتھ اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرو گے۔ اور عہد لیا کہ لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب (اُس سے) پھر گئے اور حقیقت یہ ہے کہ تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو۔ 83

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اُس کے گواہ ہو۔ پھر یہ تمھی ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو اُن کی بستیوں سے نکالتے ہو، اِس طرح کہ ظلم اور حق تلفی کے ساتھ اُن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو، اور اگر وہ تمھارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو فدیہ دے کر اُنھیں چھڑاتے ہو، دراں حالیکہ اُن کا نکالنا ہی سرے سے تمھارے لیے جائز نہ تھا۔ پھر کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے کو مانتے اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ سو تم میں سے جو یہ کرتے ہیں، اُن کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور قیامت کے دن وہ سخت سے سخت عذاب میں پہنچا دیے جائیں گے۔ (تم یہی کرتے ہو) اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے ـــــ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت دے کر دنیا کی زندگی خرید لی، اِس لیے اب نہ اِن سے عذاب ہی ہلکا ہو گا اور نہ کوئی مدد اِنھیں پہنچے گی۔ 86-84

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اُس کے پیچھے پے در پے اپنے پیغمبر بھیجے، اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (اِن سب کے بعد) کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اُس کی تائید کی (تو جانتے ہو کہ اُن کے ساتھ تمھارا رویہ کیا رہا)؟ پھر کیا یہی ہو گا کہ جب بھی (ہمارا) کوئی پیغمبر وہ باتیں لے کر تمھارے پاس آئے گا جو تمھاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی، تو تم (اُس کے سامنے)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۳ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۹۴ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۹۵ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶

تکبر ہی کرو گے؟ پھر ایک گروہ کو جھٹلا دو گے اور ایک گروہ کو قتل کرو گے ـــــ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے کہا: ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔ نہیں، بلکہ اِن کے اِس کفر کی وجہ سے اللہ نے اِن پر لعنت کر دی ہے، اِس لیے (اب) یہ کم ہی مانیں گے۔ 88-87

اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب اِن کے پاس آئی، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِن کے ہاں موجود ہیں، اور اِس سے پہلے یہ (اُسی کے حوالے سے) اپنے دین کا انکار کرنے والوں کے خلاف فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے، پھر جب وہ چیز اِن کے پاس آئی جسے خوب پہچانے ہوئے تھے تو یہ اُس کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے اِن منکروں پر۔ کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں اِنھوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا کہ محض اِس بات کی ضد میں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل اتارے، یہ اُس چیز کا انکار کر دیں جو اللہ نے اتاری ہے۔ سو یہ غضب پر غضب کمالائے اور (دنیا اور آخرت میں) اِن منکروں کے لیے (اب) بڑی ذلت کا عذاب ہے۔ 90-89

اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) جب اِن سے اصرار کیا جاتا ہے کہ اُس چیز کو مان لو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسے ہی مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اِس طرح جو کچھ اُس کے علاوہ ہے، اُس کا صاف انکار کر دیتے ہیں، دراں حالیکہ وہی حق ہے، اُن پیشین گوئیوں کے ٹھیک مطابق جو اِن کے ہاں موجود ہیں۔ اِن سے پوچھو، (وہ ہدایت جو تم پر اتری ہے)، اگر تم (اُس کے) ماننے والے ہو تو اِس سے پہلے پھر اللہ کے (اُن) نبیوں کو قتل کیوں کرتے رہے ہو (جو تمھاری طرف آئے)؟ اور حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ تمھارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا، پھر اُس کے پیچھے تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور اُس وقت تم بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ 92-91

قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَهُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۷﴾ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰٮلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۹۸﴾

اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا اور (اِس کے لیے) طور کو تم پر اٹھا دیا اور حکم دیا کہ یہ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، اِسے مضبوطی سے پکڑو، اور سنو (اور مانو) تو (تمھارے بزرگوں نے جو رویہ اُس کے ساتھ اختیار کیا، اُس نے بتا دیا کہ) اُنھوں نے (گویا اُس وقت یہی) کہا کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا۔ اور اُن کے اِس کفر کے باعث وہ بچھڑا اُن کے دلوں میں بسا دیا گیا۔ اِن سے پوچھو، اگر تم ماننے والے ہو تو کیا ہی بری ہیں یہ باتیں جو تمھارا یہ ایمان تمھیں سکھاتا ہے! 93

اِن سے کہو، اگر آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک، سب لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے لیے خاص ہے تو مرنے کی تمنا کرو، اگر تم (اپنے اِس دعوے میں) سچے ہو۔ اور (تم دیکھو گے کہ) اپنے ہاتھوں کی جو کمائی یہ آگے بھیج چکے ہیں، اُس کی وجہ سے یہ کبھی اِس کی تمنا نہ کریں گے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِن ظالموں سے خوب واقف ہے۔ 95-94

اور اِنھیں تم سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے، اور (حد یہ ہے کہ) اُن لوگوں سے بھی بڑھ کر جنھوں نے شرک کو اپنا مذہب بنایا ہے۔ اِن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کاش، وہ ہزار سال جیتا رہے، دراں حالیکہ اگر یہ عمر بھی اُس کو مل جائے تو (اِس سے) وہ اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکے گا۔ اور (اِس میں شبہ نہیں کہ) جو کچھ یہ کرتے ہیں، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ 96

(قرآن کی دشمنی میں اب یہ جبریل کے بھی دشمن ہو گئے ہیں)، اِن سے کہہ دو: جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں، وہ درحقیقت اللہ کے دشمن ہیں، اِس لیے کہ اُس نے تو (اے پیغمبر)، اِسے اللہ کے اذن ہی سے تمھارے قلب پر نازل کیا ہے، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِس سے پہلے موجود ہیں اور اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور بشارت کے طور پر جو ایمان والے ہیں۔ (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کے دشمن ہیں تو اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ 98-97

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: جو شخص اپنے آپ کو دل میں بڑا سمجھے یا اپنی چال میں تکبر اختیار کرے، وہ اللہ سے اِس طرح ملے گا کہ اللہ اُس پر سخت غصے میں ہو گا۔ (مسند احمد، رقم 5830)

— 2 —

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا جس چیز میں بھی ہو، اُس کو خوب صورت بناتی ہے، اور بے حیائی جس چیز میں بھی ہو، اُسے عیب لگا دیتی ہے۔ (الادب المفرد، بخاری، رقم 598)

— 3 —

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حیا سے ہمیشہ بھلائی پیدا ہوتی ہے۔ اِس پر بشیر بن کعب نے کہا: ہمارے ہاں حکمت کی کتاب میں لکھا ہے کہ حیا کی ایک قسم وقار اور ایک قسم سکینت ہے، اور اِسی کی ایک قسم طبیعت کی کم زوری بھی ہے۔ عمران نے اُنھیں ٹوکا اور کہا: میں تمھارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بیان کر رہا ہوں اور تم اُس کے مقابل میں مجھے اپنی کتاب کی باتیں سناتے ہو۔ (بخاری، رقم 5679)

مقامات

جاوید احمد غامدی

می باقی

حافظ شیراز نے کہا تھا:

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

مجھے نہیں معلوم، شیراز کے شاعر کی یہ آرزو بر آئی یا نہیں، لیکن میں نے بارہا دیکھا ہے کہ لاہور کے آب رکنا باد کے کنارے ساقی ہر روز صبوحی لنڈھاتا ہے۔

رکنا باد دیلمی نے جاری کیا تھا اور اُس کے زلال کا ہر جرعہ، حافظ ہی کے کہنے کے مطابق، عمر خضر بخشتا ہے:

زر کنا باد ما صد لوحش اللہ
کہ عمر خضر می بخشد زلالش

لاہور کی نہر کسی دیلمی نے جاری نہیں کی اور اُس میں زلال بھی نہیں بہتا۔ اُس کے پانی میں مٹی اِس طرح ملی ہوئی ہے، جس طرح سمندر میں شور، لیکن جو منظر اُس کی آہستہ خرامی اور اُس کے کناروں پر دورویہ درخت اور سبزہ زار پیدا کرتے ہیں، اُس کے حسن میں وہ سب کچھ ہے جو

نگاہوں میں اِس طرح ٹھیرتا ہے کہ پھر نگاہ روبرو کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آدمی اِس پر نگاہ غلط انداز بھی ڈالے تو واپس نہیں آتی اور زبان بے اختیار کہتی ہے:

دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں

رکنا باد کا پانی ''درۂ اللہ اکبر'' سے آتا ہے۔ آب خضر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس کا مقام ظلمات ہے۔ دیکھیے، حافظ نے اِس سے کیا مضمون پیدا کیا ہے:

شیراز و آب رکنی و ایں باد خوش نسیم
عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است
فرقست از آب خضر کہ ظلمات جای اوست
تا آب ما کہ منبعش ''اللہ اکبر'' است

اپنے شہر کی اِس نہر کا منبع جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ مجھے اِس کی انتہا معلوم ہے۔ رکنا باد، جیسا کہ حافظ نے کہا، ''درۂ اللہ اکبر'' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ میرے لیے ہمیشہ مقام 'اللہ اکبر' پر ختم ہوتی ہے۔ اِسے بے شک، قدرت کے ہاتھوں نے تخلیق نہیں کیا، لیکن شہر کی سنگین عمارتوں کے درمیان یہ ہر صاحب ذوق کے لیے مراقبۂ سحر کا مقام ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اُس وقت جب پو پھوٹتی اور فضا میں کچھ کچھ روشنی پھیل جاتی ہے، اِسے زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچتے دیکھا ہے۔

اِس زمانے کے شہروں میں رہنے والے، جن کے لیے دن نیۂ شب کے بعد ختم ہوتا اور صبح نیۂ روز سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے، اِسے سمجھ نہ سکیں گے۔ وہ اگر کبھی ڈوبتے تاروں کی چھاؤں میں اِس کے کنارے کھڑے ہو کر صبح کو طلوع ہوتے دیکھیں تو اُنھیں معلوم ہو کہ یہ محض آب جو نہیں، اِس عالم کے بنانے والے تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے۔

نئے تمدن نے ہمیں صرف اُس قرآن سے بے تعلق نہیں کیا جس میں حقائق لفظوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئے ہیں، اُس قرآن سے بھی محروم کر دیا ہے جس کی آیتیں صحیفۂ فطرت میں لکھی گئیں اور جسے انسان کبھی شب و روز پڑھتا تھا۔ اب وہ پہر دن چڑھے اٹھتا، برگ سیاہ کا پانی اپنے رگ و پے میں اتارتا اور سب سے پہلے اخبار پڑھتا ہے جس میں اُس کے لیے سب خبریں ہوتی ہیں، اُس کی اپنی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

اِن روز و شب میں، اُسے کیا معلوم کہ وہ صبوحی کیا ہے جو لاہور کے اِس آب رکنا باد کے کنارے لنڈھائی جاتی ہے؟ دیکھیے، کیا شعر یاد آیا۔ کسی نے شاید، اِسی طرح کے کسی مقام پر صبح کو اترتے دیکھ کر کہا تھا:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

[1986ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(6)

2۔ بنی اسرائیل پر بدلیوں کے سایے اور من وسلویٰ کی نعمتیں

قرآنِ مجید نے مختلف مقامات پر اُن عظیم الشان انعامات کا ذکر کیا ہے، جو بنی اسرائیل کو عطا کیے گئے۔ اِن میں سے بہت سی نعمتیں خرقِ عادت نوعیت کی ہیں۔ بعض اُن کے انبیا کے توسط سے اور بعض براہِ راست نازل کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں 'اٰیَۃٍ بَیِّنَۃٍ' (واضح نشانیاں) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍۭ بَیِّنَۃٍ....(211:2)

"بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں، (مگر اِس سے کیا فائدہ ہوا)؟...۔"

اِن آیاتِ بینات میں سے دو نمایاں آیات یہ ہیں کہ اُن پر بدلیوں کا سایہ کیا گیا اور من وسلویٰ اتارا گیا۔ فرمایا ہے:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ....(57:2)

”اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارے، کھاؤ یہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں دی ہیں....“

یہ اصل میں وہ انعامات ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں صحرائے سینا میں عطا فرمائے۔ اِس چٹیل صحرا میں نہ اُن کے پاس مکانات تھے، نہ خیمے اور خرگاہیں تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ کھلے آسمان تلے رہ رہے تھے۔ اِس صورتِ حال میں اُنھیں دھوپ کی حدت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ نے اُن پر بدلیوں کا سایہ کیے رکھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

”...بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل کر آئے تھے اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے اُن کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اُس زمانے میں اگر خدا کی طرف سے ایک مدت تک آسمان کو ابر آلود نہ رکھا جاتا تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی۔“ (تفہیم القرآن 1 / 78-77)

اللہ نے اُن کی سکونت کے لیے جہاں بادلوں کا سائبان تان دیا، وہاں خوانِ نعمت کے طور پر من وسلویٰ کا اہتمام کیا۔ اِس خوان سے مستفید ہونے کے لیے نہ اُنھیں زمین کو تیار کرنا پڑتا تھا، نہ فصل بونے اور کاٹنے کی مشقت اٹھانی پڑتی تھی اور نہ کھانا تیار کرنے کا تردد کرنا پڑتا تھا۔ اِس خوان کو قرآن نے من وسلویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ استاذِ گرامی نے بائیبل کی کتاب خروج کے حوالے سے اِس کے بارے میں لکھا ہے:

”یہ (مَنّ) شبنم کی طرح کی ایک چیز تھی، جو زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح جم جاتی تھی۔ بنی اسرائیل اِسے سورج کی تمازت بڑھنے سے پہلے جمع کر لیتے تھے۔ تمازت بڑھتے ہی یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں غذا کے اسباب مفقود تھے، یہ ایک عظیم نعمت تھی، جو بغیر کوئی مشقت اٹھائے بنی اسرائیل کو خدا کے حکم پر پیغمبر کے ساتھ ہجرت کرنے کے صلے میں حاصل ہوئی۔ ’مَنّ‘ کے معنی فضل و عنایت کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِسی مناسبت سے اِس کا نام ’مَنّ‘ قرار پایا۔

اِس (السَّلْوٰی) سے مراد وہ پرندے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے، یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے اور بٹیروں ہی کی طرح نہایت آسانی سے شکار ہو

جاتے تھے۔“(البیان 1/69-68)

3۔ بنی اسرائیل پر کوہِ طور کا معلق ہونا

اِسی طرح کی ایک اور نشانی وہ ہے، جب اللہ کے حکم پر کوہِ طور بنی اسرائیل کے سروں پر معلق ہو گیا۔ یعنی پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑا اور شامیانے کی طرح اُن کے اوپر لٹکنے لگا۔ یہ غیر معمولی واقعہ اُس وقت رونما ہوا، جب اللہ نے وادیِ سینا میں بنی اسرائیل پر احکام شریعت کی الواح نازل فرمائیں۔ اُس موقع پر اُن سے عہد لیا گیا کہ وہ تورات کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے اور اُس کے احکام وہدایات پر پوری طرح عمل پیرا رہیں گے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (63:2)

”اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور (اِس کے لیے) طور کو تم پر اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ اُس چیز کو پوری قوت کے ساتھ پکڑو، جو ہم نے تمھیں دی ہے، اور جو کچھ اُس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو تاکہ تم (اللہ کے غضب سے) بچے رہو۔“

سورۂ اعراف (7) آیت 171 میں اِس واقعے کے لیے ’وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ‘ (جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر اُن کے اوپر معلق کر دیا تھا گویا وہ سائبان ہے اور وہ گمان کر رہے تھے کہ وہ اُن پر گرا ہی چاہتا ہے۔) کے الفاظ آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک عظیم پہاڑ اُن کے سروں پر لٹکنا شروع ہو گیا اور وہ خیال کرنے لگے کہ یہ اب گرا کہ اب گرا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اُن پر اللہ کی قدرت کی ہیبت طاری ہو گئی۔

استاذِ گرامی کے نزدیک یہ واقعہ اللہ کی قدرت اور جلالت کا مظاہرہ تھا۔ اِس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ جو ہستی اُن سے میثاق کر رہی ہے، وہ قادرِ مطلق ہے۔ کوئی چیز اُس کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ اگر اُنھوں نے اِس معاہدے کی خلاف ورزی کی تو وہ اِس واقعے کی رو سے دولت اپنے انجام کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد پہاڑ کے دامن میں اِس طرح لیا گیا کہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ کر سائبان کی طرح اُن کے سروں پر لٹک رہا تھا

اور اُنھیں لگتا تھا کہ وہ اُن پر گر کر رہے گا۔ قرآن نے یہاں اِس حالت کو پہاڑ کے اُن پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ خدا کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا، جو اِس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ یہ عہد باندھ رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر اِس کی خلاف ورزی کی تو وہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔“(البیان 1/ 78)

4۔ اصحاب کہف کا قریباً دو سو سال تک سوئے رہنا

اصحاب کہف کو قرآنِ مجید نے ’كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا‘ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ اللہ کی نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر کم و بیش دو سو سال تک نیند کی حالت طاری رکھی اور پھر اُنھیں بیدار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ واقعہ سورۂ کہف (18) کی آیات 9 تا 25 میں بیان ہوا۔ تمہیداً واقعے کا خلاصہ بیان فرمایا ہے اور اُس کے بعد تفصیلات ذکر کی ہیں۔ تمہیدی آیات یہ ہیں:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا. اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا. فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا. ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا.(18: 12-9)

”کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے؟ اُس وقت، جب اُن نوجوانوں نے غار میں پناہ لی، پھر (اپنے پروردگار سے) دعا کی کہ اے ہمارے رب، ہم کو تو خاص اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے اِس معاملے میں تو ہمارے لیے رہنمائی کا سامان کر دے۔ اِس پر کئی برس کے لیے ہم نے اُس غار میں اُن کے کانوں پر تھپک دیا۔ پھر ہم نے اُن کو اٹھایا تاکہ دیکھیں کہ دونوں گروہوں میں سے کس نے اُن کے قیام کی مدت ٹھیک شمار

کی ہے؟‘‘

اصحاب کہف کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں، جو مسیحی تاریخ میں سات سونے والے (The Seven Sleepers) کہے جاتے ہیں۔ اِن کا تعلق افیسس (Ephesus) شہر سے ہے۔ یہ ترکیہ کے مغربی ساحل پر واقع ایک مشہور شہر تھا۔ یہ بت پرستی کا ایک بڑا مرکز تھا۔ 249ء سے 251ء تک یہاں قیصر ڈیسیس (Decius) کی حکومت قائم تھی۔ اِس عرصے کے دوران میں مسیح علیہ السلام کے پیرو اپنی دعوت لے کر یہاں پہنچے۔ اصحاب کہف اِسی شہر کے اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھنے والے چند نوجوان تھے۔ اُنھوں نے پیروانِ مسیح کی دعوت کو صدقِ دل سے قبول کیا اور جوش و جذبے کے ساتھ اُس کی تبلیغ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورا معاشرہ اُن کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہ اُنھیں سنگ سار کر دیا جائے گا۔ اِس سے بچنے کے لیے وہ شہر سے باہر ایک بڑے غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت فرمائی اور طویل مدت کے لیے اُن پر نیند طاری کر دی۔ فرشتے اُن کے پہلو بدلتے رہے۔ اُن کے کتے کو غار کے دہانے پر ایسے بٹھا دیا گیا کہ جیسے وہ پہرا دے رہا ہو۔ اللہ کے حکم سے اور اُس کے فرشتوں کی نگرانی میں یہ لوگ کم و بیش 196 سال سوتے رہے۔ پھر بالآخر قیصر تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius II) کی سلطنت کے اڑتیسویں سال 444ء یا 447ء میں یہ لوگ بیدار ہوئے۔ اِس دوران میں مسیحی مبلغین کی تبلیغ سے رومی شہنشاہ قسطنطین (337ء-272ء) عیسائیت قبول کر چکا تھا اور اِس کے نتیجے میں ساری رومی سلطنت میں مسیح علیہ السلام کا مذہب پھیل گیا تھا۔ چنانچہ جب یہ لوگ بیدار ہوئے تو ہر طرف مسیحیت کا غلبہ تھا۔ باہر کے حالات سے بے خبر اِن لوگوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو شہر میں بھیجا تاکہ وہ وہاں سے کھانا لے کر آئے۔ جب کھانا خریدنے کے لیے اُس نے قیصر ڈیسیس کے زمانے کا سکہ پیش کیا تو دکان دار کو شک ہوا کہ شاید اُسے پرانے زمانے کا کوئی دفینہ ملا ہے۔ اِس پر دونوں میں تکرار ہوئی، جس سے لوگ جمع ہو گئے۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے حکام تک پہنچ گیا۔ اُس شخص کو اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں سوالات ہوئے تو اُسے معلوم ہوا کہ قیصر ڈیسیس کو مرے تو برس ہا برس بیت چکے ہیں۔ یہ جان کر اُس نے اپنی ساری داستان اُنھیں سنا دی۔ اُسے سن کر حکام بہت حیران ہوئے اور تصدیق کے لیے اُس کو لے کر غار کی طرف چل پڑے۔ لوگوں کا ایک ہجوم اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ بات متحقق

ہو گئی کہ وہ فی الواقع قیصر ڈیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ نئے رومی حکمران قیصر تھیوڈوسیس کو اِس غیر معمولی خبر سے مطلع کیا گیا۔ وہ اُن کی زیارت کے لیے احتراماً پیدل چل کر وہاں آیا اور آ کر اُن سے برکت لی۔ اِس کے بعد یہ ساتوں نوجوان غار میں جا کر لیٹ گئے اور اچانک وفات پا گئے۔[1]

قرآنِ مجید نے اِس واقعے کو آیت قرار دیا ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ایک خارقِ عادت نشانی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اِس کے ظاہر کرنے کا سبب کیا تھا؟ استاذِ گرامی نے اِس کے بارے میں اپنا رجحان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”اِس حسی دلیل کی ضرورت غالباً اِس لیے پیش آئی کہ اُس زمانے میں مسیحی دعوت یونان کے فلسفے اور رومی شرک و بت پرستی کی روایت سے نبرد آزما تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نشانی دکھائی تاکہ زندگی بعد موت کے معاملے میں عقلی دلائل کے ساتھ یہ حسی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ نئے نئے جو لوگ ہزاروں کی تعداد میں مسیحی ہوئے ہیں، اُن کے لیے دین کا یہ بنیادی عقیدہ فلسفیانہ موشگافیوں کا موضوع بن کر نہ رہ جائے۔ بائیبل اور قرآن، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں اِس طرح کے حسی دلائل اِس سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔“ (البیان 3/131)

[باقی]

1۔ یہ تفصیلات ”البیان“ میں سورۂ کہف کے حواشی 8 تا 36 سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

گمانوں کے لشکر

[”نقد و نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

احمد جاوید صاحب نے ہمارے مضمون ’احمد جاوید صاحب کے مذہبی افکار: ایک تنقیدی جائزہ‘ کے جواب میں قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت کے مفاہیم کی جو توضیح اپنے ویڈیو بیان میں پیش کی ہے، اس کے بعد ہمارے موقف پر ان کا نقد بالکل بے محل ٹھیرا ہے۔ ان کے مطابق:

1۔ کلام کی قطعیت کا مطلب اس کے کلی معانی ہیں۔ اس کلیت میں معانی کی تمام جہات، اس کے مصداقات، اطلاقات، اشارات، اور مخاطب میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات سبھی شامل ہیں۔

2۔ متکلم، مخاطب، وقت اور تناظرات جیسے عوامل لفظ کے معانی میں مسلسل تغیر اور تنوع پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ کلام صرف متکلم کے لیے قطعی ہو سکتا ہے (اگر متکلم کا علم لامحدود ہو، ورنہ خود اس کے لیے بھی قطعی نہیں ہو سکتا)، مخاطب کے لیے نہیں۔

3۔ معنی کی اس قطعیت کا فہم کی قطعیت میں منتقل ہونا محال ہے۔ چنانچہ ہر کلام ظنی ہے، تاہم یہ ظنیت قطعیت کی مخالف اور متضاد نہیں، بلکہ اس کے مفہوم میں زیادت کا امکان دکھاتی ہے۔

اس کی توضیح میں انھوں نے جنت کی مثال دی کہ اس کا معنی معلوم ہے مگر جنت کیسی ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ معلوم نہیں۔ چنانچہ یہ قطعی بھی ہے اور ظنی بھی۔

اس کے مقابل ظنی الدلالت کی اصولیین کی تعریف، جس کا حوالہ ہم نے گذشتہ مضمون میں بھی پیش کیا تھا، یہ ہے کہ یہ فقط نقیض کا احتمال ہے جو کسی کلام میں پیدا ہو جائے اور رفع نہ ہو سکے تو اسے ظنی سمجھا جاتا ہے۔ احمد جاوید صاحب نے اس تعریف کو سطحی اور معمولی درجے کی قرار دیتے ہوئے اپنی وضع کردہ تعریف پر اصرار کیا۔ قطعی الدلالت کے باب میں ہم کوئی نئی بات نہیں لائے۔ یہی موقف ہے جو ہمیشہ سے اصولیین کا رہا ہے۔ اسی کی بنیاد پر فقہا اور مفسرین اپنے لیے معانی کی ترجیح قائم کرتے اور مقابل معانی کی تغلیط کرتے ہیں۔ اس معاملے میں احمد جاوید صاحب کی ہر تنقید اور تنقیص علم کی پوری روایت پر تنقید و تنقیص ہے۔ اپنے احتمالات کے جس گنبد میں داخلے کی دعوت وہ بہ اصرار دے رہے ہیں، اس میں شعر و ادب کی کوئی صنف داخل ہو تو ہو، علم اور اس کی روایت داخل نہیں ہو سکتے۔

دلالت کے محل میں مذکورہ احتمالات غیر متعلق امور کو شامل کر لینے سے پیدا کر لیے گئے ہیں۔ متکلم اور مخاطب کی تعیین اور تناظراتِ کلام کی رعایت معنی کے احتمالات میں اضافہ نہیں کرتے، اس کی تعیین میں مددگار ہوتے ہیں۔ 'نماز قائم کرو' کا متکلم خدا اور مخاطب انسان ہوں تو یہ حکم کا بیان ہو گا اور یہی الفاظ ایک شخص اپنے رفیق سے کہے تو نصیحت سمجھی جائے گی۔ کوئی ابہام پیدا ہونے کی گنجایش نہیں۔

کلام سے مخاطب میں پیدا ہونے والی داخلی کیفیات اور تاثرات کا کوئی تعلق معنی سے نہیں ہوتا۔ یہ بالکل الگ معاملہ ہے۔ ''اندر آ جایئے'' کا مفہوم اندر بلا لینا ہی ہے، متکلم کی شخصیت مخاطب پر جو اثر پیدا کرتی ہے وہ معنی کا خاصہ نہیں۔ ایسا اثر بغیر کلام کے بھی ممکن ہو سکتا ہے۔[1]

---

[1]۔ اپنے ایک لیکچر ''متن اور اس کا فہم'' میں انھوں نے ایک مثال سے اپنے موقف کی وضاحت کی کہ بالفرض وہ مولانا طاہر القادری صاحب کے دروازے پر تشریف لے جائیں اور وہ کہیں کہ ''اندر آ جایئے''، پھر افلاطون کے دروازے پر دستک دیں اور وہ بھی کہیں کہ ''اندر آ جایئے'' تو دونوں حضرات کے یہ ایک جیسے الفاظ کا مفہوم ''تضاد'' کی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔ مفہوم میں یہ جبری

مصداق کو معنی میں شمار نہیں کیا جاتا۔ 'صبح' کے دس مصداقات ہو سکتے ہیں، مگر اس کا کوئی تعلق صبح کے معنی سے نہیں۔ نیز، مصداق کی حقیقت و ماہیت اگر مشاہدہ اور تجربہ سے ماورا ہو تو اسے متشابہات کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

کسی مفہوم یا تصور کے اطلاقات نامختتم ہو سکتے ہیں، مگر اس سے بھی معنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ 'امرھم شوریٰ بینھم' کے متعدد اطلاقات گنوائے جاسکتے ہیں: قبائلی معاشرت کی مشاورت، دور جدید کی جمہوریت، پھر جمہوریت کی متعدد صورتیں، مگر اس سے مشاورت کے مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اشارۃ النص سے اضافی مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ 'فلا تکن من الممترین' میں مخاطب رسول، مگر رخِ خطاب منکرین کی طرف ہونا سمجھ لیا جاسکتا ہے، یہود کے باطل رویوں پر خدا کی تعریضات میں مسلمانوں کے لیے تنبیہات کا سامان دیکھا جاسکتا ہے۔ اسے معنی میں زیادت نہیں کہا جاتا۔

کلام سے استنباطات معنی کی نہیں، حکم یا ہدایت میں موجود اس کی علت یا وجہ کی تعمیم و اطلاق ہوتا ہے۔ روزہ رکھنے میں رخصت کا حکم مریض اور مسافر کے لیے بیان ہوا ہے،[2] یہ مگر انھی دو تک محدود نہیں۔ اس رخصت کی علت یعنی غیر معمولی مشقت جب دوسری صورتوں میں بھی پائی جائے گی تو حکم کا اطلاق توسیع پائے گا۔ اس عمل کو معنی میں اضافہ نہیں کہتے۔

ظنی الدلالت کی بحث کا اب صرف ایک ہی محل رہ جاتا ہے کہ کلام میں ایک سے زائد غیر متضاد احتمالات میں کسی ایک مفہوم کو قطعیت سے طے کرنا۔ یہ نظری بحث کا زمرہ ہے۔ جہاں وجہِ ترجیح دلائل کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ لفظ کا معنی، جملے کی تالیف، محاورے کی رعایت، سیاق و سباق کا لحاظ، متکلم اور مخاطب کی تعیین سے کلام کا معنی متعین کیا جاتا ہے۔ یہاں نتائجِ فکر قطعی بھی ہو جاتے ہیں اور ظنی بھی۔ اس سب کے باوجود فہم میں خطا ہو جائے تو انھیں انھی ذرائع سے اسے درست کیا جاتا ہے۔ علم کی دنیا میں یہ وہ محکم مسلّمہ بنیادیں ہیں جہاں علمی بحث ممکن بھی ہے اور فیصلہ کن بھی۔ فہمِ کلام سے متعلق یہ تمام رعایات ہر علمی ڈسکورس کا حصہ ہوتی ہیں۔ ہر قانون دان،

تنوع نما تضاد پیدا کرنے میں انھوں نے وہی چیزیں داخل کیں جو اوپر بیان ہوئیں۔

2۔ البقرہ 2:184۔

ہر مفسر، ہر فقیہ یہی کرتا آیا ہے اور کر رہا ہے۔

اس کے بعد قطعی الدلالت کے مفہوم پر احمد جاوید صاحب کے اعتراضات کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ دلالتِ کلام کے باب میں جس تصور کو انھوں نے اپنا لیا ہے، اسے اختیار کر لیا جائے اور معنی اور مفہوم کی تعیین میں راجح اور مرجوح کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ اس تصور کا اطلاق ادب کی بعض اصناف پر تو ہو سکتا ہے، مگر ابلاغ معنی کی خاطر وضع کردہ کلام پر نہیں ہو سکتا۔ عدالتی کارروائیوں، قانونی اور کاروباری وثائق، حکومت اور اداروں کے فرامین کے زبان وکلام پر ان تصورات کا اطلاق کر کے دیکھیے، طبیعت کسی وضاحت کا محتاج نہیں رہے گی۔

احتمالات پر مبنی اس فلسفے کا محل محض تخیل ہے۔ موہومات کی دنیا ہے جہاں کچھ ثابت کرنا پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہ خیالی ترک تازیاں ذہنی دل چسپی کا کچھ سامان پیدا کر لیتی ہیں، مگر علم کی حقیقی دنیا کے حقیقی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ دینی معاملات میں قرآن کی صورت (میں) جو کلام ہمیں میسر ہے، اس کا اعلان یہ ہے کہ وہ دینی اختلافات میں فیصلہ کن اتھارٹی، میزان و فرقان بن کر آیا ہے۔ چنانچہ ہمیں طے کرنا ہے کہ 'خاتم النبیین' میں 'خاتم' سے مراد مہر بندی ہے یا مہر ثبت کرنا۔ پہلے مفہوم سے نبیوں کے سلسلے کا اختتام متبادر ہوتا ہے اور دوسرے سے جاری۔ تیمم کے باب میں بیان کردہ صورتیں: بیماری، سفر اور پانی نہ ملنا، تین ہیں یا دو، یعنی کہ سفر میں پانی نہ ملنا، پانی نہ ملنے کی ایک فرعی صورت کا بیان ہے یا مستقل صورت ہے۔ اختلاف اس کے باوجود ختم نہیں ہوتے، یہ مگر کلام کی نقص نہیں، انسانی رویے کا مسئلہ ہے جو بدیہات اور تجربیات تک میں مختلف الرائے ہو جانے کا حوصلہ کر لیتا ہے۔ زبان و بیان کے مسلمات کی بنیاد پر پیش کردہ مفاہیم کی قطعیت اہل عقل و دیانت کے لیے کفایت کرتی ہے۔ وحسابھم علی اللہ

رہی یہ بات کہ کیا جو مفہوم عند اللہ قطعی ہے، مخاطب نے وہی قطعی مفہوم پایا؟ نظری طور پر تو اس کا جواب یہی ہے کہ اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کلام کا وہی مفہوم سمجھا گیا ہے جو خدا کے نزدیک بھی ثابت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اپنے کلام میں احتمالات اور ابہامات کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑی۔ عربی ہی نہیں، عربی مبین یعنی معروف معانی اور معروف اسالیب کا استعمال، اجمال کے بعد تفصیل کا التزام، تصریفِ آیات یعنی ایک ہی بات کو مختلف پیرائے میں بہ

تکرار بیان کرنے کا انتظام، ابلاغ معنی کے لیے یہ غیر معمولی اہتمام اس بات کے لیے عملاً کوئی گنجایش نہیں رکھتا کہ جو مراد قطعیت سے ہمیں پہنچانا مقصود ہے، وہ ہم تک نہیں پہنچی ہو گی۔

لایعنی احتمالات پر مبنی فلسفوں کا اصل مقصود تعطیلِ معنی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔ معنی کے تعطل کا یہ ایک اثبات ہر دوسرے اثبات کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد علم و یقین کے لیے کوئی بنیاد میسر نہیں رہتی۔ فہم کلام پر اعتماد کی ہر راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ نتیجہ بے یقینی ہے جو حاصل فکر ہی نہیں، سرمایۂ افتخار بھی ہے۔ دین و ایمان کے انکار کی اب ضرورت نہیں رہی کہ کسی اقرار کے لیے کوئی بنیاد ہی موجود نہیں۔ اب ایمان یا تو تہذیبی قدر کے طور پر اختیار کیا جائے گا یا علمی شرائط سے بے نیاز ہو کر۔ یہ وہ تشکیک ہے جسے کوئی یقین زائل نہیں کر سکتا۔ احتمالات کا وہ غلاف ہے کہ مسلمات اور قطعیات اس میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتیں۔ 'شك مريب' کی وہ دل فریبی ہے جس نے تعیینِ معنی کی جکڑ بندیوں سے بے مہار آزادی دلا دی ہے۔ 'فی شك یلعبون' کے چلتے پھرتے نمونے ہیں جنھیں ہم اتباع ظن کے پھریرے لہراتے دیکھتے ہیں۔ علم و فہم کی راہ سے اس فکر سے خطاب کا راستہ بھی مفقود ہے۔

یہ سب مگر درحقیقت کچھ بھی نہیں، محض تخیل کی کارفرمائی ہے۔ گماں آباد سے نکلتے ہی یہ سب احتمالات ہوا ہو جاتے ہیں۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکلتا، مگر اس سے پہلے زبان اور علم و عقل کے ان گنت مسلمات اضطراراً تسلیم کیے جا چکے ہوتے ہیں۔ عین اس وقت جب آدمی مسلمات کی نفی کر رہا ہوتا ہے، اس کا عمل اس کی نفی کر دیتا ہے۔

احتمالات و مجردات کی دنیا کو حقیقت کی دنیا میں لانا بڑی خطا کی بات ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں احمد جاوید صاحب لفظ و معنی کے تار و پود بکھیرتے رہیں، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن انھیں احساس ہونا چاہیے کہ گمانوں کے لشکر یقین کو بے ثبات نہیں کر سکتے۔

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

نقطۂ نظر

ابو سعد اعظمی

قدیم مفسرین کے تسامحات اور مولانا فراہیؒ

(1)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

مولانا فراہی (1863ء-1930ء) علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی قرآن کریم میں غور و فکر اور تدبر و تفکر میں بسر کی۔ جدت و ابتکار اور تحقیقی شان ان کی تصانیف کا امتیازی وصف ہے۔ انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ نظم قرآن کا فلسفہ پیش کیا اور اپنی تفسیر میں اس کی رعایت کرتے ہوئے عملی طور پر اس کا انطباق کرکے دکھایا۔ فلسفۂ نظم قرآن پر شدت اعتنا کی وجہ سے مولانا فراہی سے متعلق بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی جڑ پکڑ گئی کہ آپ نے احادیث کے معاملہ میں استخفاف سے کام لیا ہے اور اپنی تفسیر میں عملاً اس سے اغماض برتا ہے۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی فراہم ہوئی کہ مولانا فراہی کی مرتبہ تفسیر میں احادیث بہت کم نقل ہوئی ہیں اور بعض صحیح روایات کے سلسلہ میں بھی ان کا موقف عام موقف سے الگ ہے۔ حالانکہ اگر مولانا فراہی کے سلسلہ میں یہ خیال بھی عام ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص فلسفۂ نظم قرآن کی وجہ سے تفسیر منقول یا ماثور کے ذخیرہ سے اغماض برتا ہے اور صرف نظم کی روشنی میں

آیت کا مدعا و مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک بے بنیاد خیال ہے۔ مولانا فراہی نے اپنے مقدمہ میں ببانگ دہل یہ صراحت کی ہے کہ میرے نزدیک قرآن کی سب سے بہترین تفسیر وہ ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔[1]

واضح رہے کہ مولانا فراہی کو عمر عزیز نے اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنا تفسیری کام مکمل کر سکیں۔ انھوں نے چند چھوٹی سورتوں کی تفاسیر لکھیں اور سورۂ بقرہ (نامکمل)، آل عمران کی چند آیات، سورۃ الحج اور الذاریات کی تفسیر قلم بند کی۔ ان سورتوں کی تفسیر و توضیح میں انھوں نے فلسفۂ نظم قرآن کو برتنے کی کامیاب کوشش کی اور آیت کا دل نشیں و صحیح مفہوم پیش کیا۔ اس کے علاوہ ان کے تفسیری حواشی ہیں جو مولانا فراہی کی قرآنی فکر اور ان کی قرآنی بصیرت کو سمجھنے میں حد درجہ معاون ہیں۔ قرآنی حواشی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مولانا فراہی کو فہم حدیث میں بھی درک حاصل تھا اور وہ تمام تر اس کو قرآن کریم سے ماخوذ سمجھتے تھے نیز قدیم تفاسیر کا پورا سرمایہ ان کی نظر میں تھا اور انھوں نے ان کا بالاستیعاب اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی فراہم ہوتی ہے کہ انھوں نے علوم القرآن کی بعض اہم کتب مثلاً ''الاتقان فی علوم القرآن'' وغیرہ پر بھی باقاعدہ حواشی چڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ نظم قرآن کی رعایت کرتے ہوئے وہ جس معنی و مفہوم تک پہنچتے اس کی تائید و تصویب میں صحابۂ کرام میں سے کسی نہ کسی کی رائے انھیں ضرور مل جاتی۔

مولانا فراہی نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ انھیں سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، لیکن چونکہ تفسیری روایت میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات شامل ہیں، اس لیے انھوں نے اسے ظنی ماخذ میں شامل کیا ہے۔[2] البتہ اگر کسی آیت کی توجیہ سے متعلق انھیں کوئی صحیح حدیث مل گئی ہے تو انھوں نے بلاتردد و توقف کے اپنے قائم کردہ موقف سے رجوع کر لیا ہے اور صحیح حدیث کو فوقیت دی ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ سورۃ الحجر میں وارد آیت 87 میں ''سبع مثانی'' سے کیا مراد

---

[1]۔ فراہی، حمید الدین، تفسیر نظام القرآن، اردو ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی 35۔

[2]۔ ایضاً 36۔

ہے، اس کی توجیہ کرتے ہوئے مولانا فراہی لکھتے ہیں:

"... مشہور تاویل کے لحاظ سے یہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔ یہ تمام تاویلیں اسی صورت میں لائق اعتماد ہو سکتی ہیں جب ان سے متعلق بیان کردہ حدیث صحیح ہو، ورنہ سبع مثانی سے دوسرے معانی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں، مثلاً حم سے شروع ہونے والی سات سورتیں اور سورۂ بقرہ سے سورۂ حجر تک کی چودہ سورتیں۔"[3]

لیکن سورۂ فاتحہ کے شروع میں مولانا فراہی اسے سبع مثانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سورہ (سورۂ فاتحہ) کی حیثیت ہمارے علما پر خود قرآن سے روشن ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا احسان عظیم جتاتے ہوئے فرمایا 'وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ' (الحجر: 87) "ہم نے تم کو سات دہرائی ہوئی اور قرآن عظیم دیا۔" سلف سے لے کر خلف تک علما کا اتفاق ہے کہ سبع مثانی سے مراد یہی سورۂ فاتحہ ہے۔"[4]

سبع مثانی کے سلسلے میں مولانا فراہی کی اتنی واضح اور قطعی رائے کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی نے "سبع مثانی" کے سلسلے میں علما کے تین اقوال بیان کیے ہیں اور ان پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے آخر میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔[5] جس سے اختلاف کی پوری گنجایش ہے۔

چونکہ قدیم مفسرین کے یہاں بالعموم ایک روایت سے متعلق مختلف تفسیری روایات نقل کر دی گئی ہیں اور ان کے ضعف و صحت کے پہلو سے اغماض برتا گیا ہے اس لیے مولانا فراہی نے ان تفسیری روایات پر بہت زیادہ توجہ صرف نہیں کی ہے۔ لیکن اس سے یہ خیال کر لینا کہ انھوں نے تفسیر ماثور سے صرف نظر کرتے ہوئے تفسیر بالرائے کا سہارا لیا ہے، درست نہیں ہے۔ تعلیقات کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے قدیم تفسیری سرمایہ کا دقت و باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ طبری، رازی، کشاف، بیضاوی، جلالین وغیرہ ان کی نظر میں ہیں چنانچہ انھوں نے ان حواشی میں متعدد مقامات پر ان تفاسیر کا حوالہ دیا ہے اور بعض ایسے مقامات پر جہاں انھیں ان تفاسیر میں

---

[3] ۔ امام فراہی کے قرآنی حواشی، ترجمہ و ترتیب عبید اللہ فراہی، تصحیح مولانا امانت اللہ اصلاحی 255۔

[4] ۔ فراہی، حمید الدین، تفسیر نظام القرآن 79۔

[5] ۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن 2/378-377۔

بیان کردہ موقف سے اختلاف ہوا ہے اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ یا اگر ان کی نقل کردہ روایت میں ضعف کا کوئی پہلو ہے تو مولانا فراہی نے اس کی نشان دہی کی ہے اور واضح کیا ہے کہ ان مقامات کی تفسیر میں انھوں نے جو لاطائل روایات نقل کی ہیں حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس مقالہ میں ایسے ہی مقامات کی نشان دہی اور مولانا فراہی کی گرفت اور ان کی تنقیدی بصیرت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

1۔ سورۂ بقرہ آیت 113 ’... فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ‘ میں ’یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ‘ کا لفظ آیا ہے۔ مولانا فراہی نے تفسیر القرآن بالقرآن کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور آیت کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ ”یعنی بدعات اور خواہشات نفس کو محبوب رکھنے کی وجہ سے دین کے جس معاملے میں یہ باہم جھگڑ رہے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں کئی جگہوں پر آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے ’وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ‘ (الشوریٰ:10)، دوسری جگہ فرمایا ہے ’فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۬ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ‘ (الجاثیہ:17)۔ پھر ابن جریر پر یہ کہتے ہوئے تنقید کی ہے کہ ابن جریر نے آیت مذکور کی تفسیر میں متعدد طویل تفسیری روایات ذکر کر دی ہیں اور اس کے ضعف کی نشان دہی سے اغماض برتا ہے۔[6]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ فراہی سے یہاں تسامح ہو گیا ہے کیونکہ تفسیر طبری سے رجوع کرنے پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہاں ابن جریر نے اس ضمن میں کوئی روایت نقل نہیں کی ہے اور آیت کا تقریباً وہی مفہوم بیان کیا ہے جو علامہ فراہی کے پیش نظر ہے۔[7] شاید یہی وجہ ہے کہ عبید اللہ فراہی اور امانت اللہ اصلاحی رحمہما اللہ نے تعلیقات کے اردو ترجمہ میں مولانا فراہی کی اس گرفت کو حذف کر دیا ہے۔[8]

2۔ سورۂ بقرہ آیت 213 ’کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً‘ کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[6]۔ الفراہی، عبد الحمید، تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم 1/44۔

[7]۔ طبری، ابن جریر، جامع البیان 1/725۔

[8]۔ فراہی، قرآنی حواشی 36۔

”آیت کریمہ کا مطلب ہے کہ سب اللہ کے نزدیک ایک امت ہیں جیسا کہ دین کے بارے میں فرمایا کہ ’اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ‘ (آل عمران:19) یا جیسا کہ فرمایا: ’فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا‘ (الروم:30)۔ یہاں ’کان‘ دوام کے مفہوم میں ہے جیسا کہ آیت کریمہ ’وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا‘ میں ہے۔ مذکورہ آیت کی تاویل میں مفسرین سے لغزش ہوئی ہے اور انھیں اشکال پیش آیا ہے۔“[9]

تفسیر طبری سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ اس آیت کی تشریح میں مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں[10] جب کہ علامہ فراہی نے تفسیر القرآن بالقرآن کی روشنی میں اس کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

3۔ سورۂ بقرہ آیت 259 ’اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ...‘ کی تشریح میں مولانا فراہی لکھتے ہیں:

”امام زمخشری نے دوسری مثال کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بستی کی طرف سے گزرنے والا شخص آخرت کا منکر تھا کیونکہ اس کا ذکر نمرود کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔[11] اس کے کافر ہونے کا دوسرا ثبوت انھوں نے یہ پیش کیا ہے کہ اس نے احیاے موتی کے لیے کلمۂ استبعاد استعمال کیا اور کہا ہے کہ اس بستی کے ویران ہو جانے کے بعد خدا کس طرح اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بستی سے گزرنے والے شخص حضرت عزیر یا حضرت خضر تھے جو دیکھنا چاہتے تھے کہ اللہ کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا تاکہ ان کی بصیرت میں اضافہ ہو، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح مردوں کو زندہ کرے گا، اس کے تصور سے وہ عاجز ہیں اور زندہ کرنے والے کی طاقت کی بڑائی کا انھیں احساس ہے۔“[12]

---

[9]۔ الفراہی، تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم 1/68۔

[10]۔ طبری، جامع البیان 2/371-368۔

[11]۔ زمخشری، الکشاف 1/389۔

[12]۔ الفراہی، تعلیقات 1/80۔

تفسیر کشاف سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ امام ناصر الدین احمد بن محمد بن المنیر الاسکندری المالکی نے زمخشری کے اس قول سے اختلاف کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ نمرود کے پہلو بہ پہلو اس واقعہ کے بیان ہونے سے اس کے کفر پر استدلال کرنے کی بہ نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیاق میں اس واقعہ کے نقل ہونے کی بنا پر اس شخص کے ایمان پر استدلال کرنا زیادہ قریب صواب ہے۔[13]

4۔ آل عمران آیت 110 'كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> ”فعل جمع کی نسبت مجموعہ افراد کی طرف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی نسبت جماعت کے ایک ایک فرد کی طرف ہے۔ ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ امر بالمعروف امت کے ہر فرد پر واجب ہے۔ اس طرح انھوں نے آیت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی۔ ان کی راے میں 'منکم' میں 'من' تبعیض کے لیے نہیں ہے چنانچہ شاذ مفہوم کو انھوں نے اختیار کیا اور مشہور معنی کو چھوڑ دیا۔ ان کی تفسیر اصول تاویل کے خلاف ہے اور سنت و حکمت اور قریب کی نظیر کے بھی خلاف ہے کیونکہ دو آیتوں کے کے بعد ہی فرمایا ہے 'لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ' (آل عمران: 113)۔ ظاہر ہے کہ آیت کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ تمام اہل کتاب اسی طرح ہیں۔“[14]

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے مولانا فراہی کی راے پر حاشیہ لگایا ہے کہ ”اس آیت میں جو مطلوب کے بیان میں ہے 'من' وسط کلام میں ہونے کی وجہ سے بیان کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور تبعیض کے لیے بھی جب کہ قریب کی نظیر میں جو بیان واقعہ کے لیے ہے، اصل کلام میں ہونے کی وجہ سے اس کا تبعیض کے لیے ہونا قطعی ہو جاتا ہے۔ ابن تیمیہ کی راے کی تائید اس سے بھی ہو رہی ہے کہ اگلی آیت 'من' سے خالی ہے۔“[15]

13۔ زمخشری، الکشاف 1/ 389۔

14۔ الفراہی، تعلیقات 1/ 109۔

15۔ فراہی، قرآنی حواشی 86۔

5۔ آل عمران، آیت 161 ’وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ‘ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”’غل‘ (کینہ، حسد، خیانت اور بدخواہی) ”نصح“ (خیر خواہی) کی ضد ہے۔ کوئی بھی نبی ایسا نہیں کرتا کہ اپنی ذاتی خواہش اور پسند کی بنیاد پر اہل ایمان کو کسی ایسی بات کا حکم دے جس میں ان کی تباہی اور بربادی ہو اور وہ قتل کر دیے جائیں یا انھیں زخم پہنچے۔ بلکہ وہ جو بھی حکم دیتا ہے اس میں اللہ کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔ اس لیے اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا اعتراف کریں کہ اس نے انھی میں سے ایک رسول ان کے پاس بھیجا جو اس کی آیتیں انھیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ تذبذب میں پڑیں اور اس کے حکموں کے بارے میں غلط خیال اپنے دل میں لائیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر ان کے ساتھ بدخواہی کرے جب کہ وہ جانتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے نیک و بد کا پورا پورا بدلہ دے گا اور اس کی بدنیتی کو اس کے سامنے لا کر رکھ دے گا۔ جن لوگوں کی سمجھ میں دونوں آیتوں کا مفہوم نہیں آیا ہے، ان کا خیال ہے کہ ’غل‘ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جسے اٹھائے ہوئے آدمی قیامت میں حاضر ہو نہ کہ اعمال۔ مفسرین نے آیت کے سیاق و سباق پر کماحقہ غور نہیں کیا، یہاں مال غنیمت کے ذکر کا کوئی موقع ہی نہیں ہے، چنانچہ نظم کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے انھوں نے یہاں مختلف قسم کے قصے بنا لیے اور آیت کی من مانی تاویل کر ڈالی،[16] حالانکہ قرآن سے ان کے نقطۂ نظر کی نفی ہوتی ہے۔“[17]

لفظ ’غل‘ کی علامہ فراہی نے جو تشریح پیش کی ہے وہ مزید غور و فکر کی متقاضی ہے۔ یہاں انھوں نے مفسرین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے آیت کے سیاق و سباق پر کماحقہ غور نہیں کیا، حالانکہ تفسیر طبری سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ آیت کی تشریح اور بالخصوص ’غل‘ کی توضیح میں متعدد طویل روایات پیش کی گئی ہیں۔ اگرچہ تفسیر طبری کے فاضل محقق منصور عبدالحمید نے حواشی میں ان میں سے اکثر روایات کو ضعیف یا مرسل قرار دیا ہے، لیکن مفسرین بالعموم آیت مذکورہ میں وارد ’غل‘ کی تفسیر انھی روایات کی روشنی میں کرتے ہیں۔[18] جب کہ مولانا

---

[16]۔ طبری، جامع البیان 3/516-509۔

[17]۔ الفراہی، تعلیقات 1/118۔

[18]۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، طبری، جامع البیان 3/516-509۔

فراہی کو ان روایات کی صحت کے سلسلے میں اشکال ہے اور انھوں نے آیت کے نظم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا منفرد مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا فراہی نے 'غل' کی تشریح میں نظم کلام کی رعایت کرتے ہوئے جو تشریح پیش کی ہے اسے ان کا تفرد ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ معلوم نہیں کس بنیاد اور کن وجوہات کی بنا پر تعلیقات کا اردو ترجمہ جو "مولانا فراہی کے قرآنی حواشی" کے نام سے چھپا ہے اس میں اس آیت کے ضمن میں بھی مفسرین پر جو نقد ہوا ہے، اسے حذف کر دیا گیا ہے۔[19]

[باقی]

---

[19]۔ فراہی، قرآنی حواشی 92-91۔

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

مولانا امین احسن اصلاحی

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت

(1)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اور آپ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت سے متعلق ہمارے اندر جو گم راہیاں آج پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے یہ چند بڑی بڑی گم راہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر معرفتِ الٰہی کے حصول کا واحد راستہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی ہے تو ان گم راہیوں کی موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تو ہمارا صحیح ربط ہی قائم ہو سکتا ہے اور نہ وہ چیز ہی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر سکتے ہیں جس کے حاصل ہونے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم واحد ذریعہ ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی ہدایت کی ہے ہم وہ بنیادیں واضح کر دیں تاکہ جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے وہ خدا تک پہنچنے کے واحد ذریعے کے ساتھ اپنی ٹھیک ٹھیک وابستگی قائم کر سکے۔

ہمارے نزدیک قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر قائم کیا ہے۔

ایمان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی پہلی بنیاد ایمان ہے۔ ایمان کا مطلب صرف

یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں، بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین ہیں۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت ہے اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو راہ دکھائی ہے اگرچہ بظاہر اس میں کتنے ہی خطرات نظر آ رہے ہوں، لیکن نجات اور فلاح کی حقیقی راہ وہی ہے۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے جو اصول سکھائے ہیں وہ وقتی اور عارضی نہیں ہیں، بلکہ وہ دائمی اور ابدی ہیں۔ اور انسان ان سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکے گا اور سب سے بڑھ کر اس بات پر اعتماد کہ خدا کی معرفت کا جو طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور سکھایا ہے، اس سے بڑھ کر نہ کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

جب تک آدمی کے اندر یہ اعتماد نہ پیدا ہو، مجرد اس تصدیق سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا، اور نہ یہ ایمان اس معرفت کے نقطۂ نظر سے کچھ کارآمد ہوتا ہے جو اس ایمان کی حقیقی غایت ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

ذاق طعم الایمان من رضی باللّٰہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولاً. (مسلم)	”ایمان کا مزا اس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہو گیا۔“

یہی اعتماد ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کبھی کبھی یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ”ہم ان میں سے بعض باتیں نوٹ کر لیا کریں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنے دین کے بارہ میں حیرانیوں میں پڑ گئے اسی طرح تم بھی حیرانیوں میں پڑنا چاہتے ہو، میں نے تمھارے سامنے اللہ کے دین کو

بالکل روشن اور شفاف صورت میں رکھا ہے۔ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔[1]

یہی بات ایک دوسری روایت میں کچھ مختلف طریقہ پر وارد ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا سوال پر کچھ خفگی کا بھی اظہار فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کا احساس ہوا تو وہ فوراً پکار اٹھے۔

رضیت باللّٰہ ربًا وبالاسلام دینًا وبمحمد نبیًا.[2]

”میں اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنا نبی ہونے پر پوری طرح مطمئن ہوں۔“

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جہاں تک اللہ کی معرفت کا راستہ دکھانے اور خدا کی صراط مستقیم کو واضح کرنے کا تعلق ہے، یہ کام بہتر سے بہتر طریق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوتے تو اسی طریقہ کی پیروی کرتے۔ ظاہر ہے کہ حق کی رہنمائی کے نقطۂ نظر سے جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی شریعت کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تو دوسرے اشخاص اور ان کے علوم وافکار اور نظریات وتجربات کی کیا وقعت باقی رہتی؟ دوسرے علوم وافکار اگر کچھ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جہاں تک وہ کتاب وسنت کے موافق ومویدہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی فکر وفلسفہ کو یا کسی وجدان وکشف کو یا کسی طریقہ اور تجربہ کو نبی کے علم وعمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھیرائے یا اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے تو اس کا دعوے

---

[1]۔ مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ۔

[2]۔ مشکوٰۃ، باب مذکور۔

ایمان محض ایک فریب نفس ہے کیونکہ اس کا ایمان اس اعتماد سے بالکل خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے۔

اطاعت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری شرط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت ہے۔ دنیا کا کوئی نبی اور رسول بھی اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں، بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت بھی کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایات وہ دے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ.(النسا4:64)	”ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول، مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

دوسری جگہ ہے کہ آدمی کے نیک اعمال کی قبولیت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو اس کے تمام اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ.(سورۂ محمد 33:47)	”اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو رائیگاں نہ کرو۔“

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے مطالبہ کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت جو اصل مقصود ہے اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا، بلکہ اپنے رسول کے واسطہ سے کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کی یہ اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ.	”جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس

نے اللہ کی اطاعت کی۔"

رسول کا ہاتھ لوگوں کے لیے اللہ کے ہاتھ کا قائم مقام ہوتا ہے، جو لوگ رسول کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ گویا بالواسطہ اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ. (الفتح 10:48)	"جو لوگ تم سے بیعت کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں اللہ ہی کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔"

خود احادیث میں بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا راستہ یہی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی جائے۔ مثلاً:

من اطاع محمدًا فقد اطاع اللّٰہ ومن عصی محمدًا فقد عصی اللّٰہ ومحمد فرق بین الناس. (بخاری)	"جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نشان امتیاز ہیں۔"

قرآن مجید میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ یہ اطاعت محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے طور پر اپنے آپ کو خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کے تابع کر دے، آپس میں جتنے قضیے اور مسئلے بھی پیدا ہوں، ان سب کے طے کرنے کے لیے کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیا جائے، اور پھر کتاب و سنت کے فیصلوں کو دل کے پورے اطمینان اور طبیعت کی پوری رضامندی کے ساتھ قبول کیا جائے، ان کے خلاف دل کے اندر کسی قسم کی بدگمانی یا شکایت نہ رہے، فرمایا ہے:

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا	"پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہیں جب کہ ان تمام معاملات

يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (النسا4:65)

میں جو ان کے درمیان پیدا ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمھارے فیصلہ سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور وہ پورے طور پر اپنے آپ کو تمھارے تابع نہ بنائیں۔"

ان آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کا تعلق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ خاص ہمارے درمیان موجود نہیں رہی تو اس اطاعت کا سوال بھی باقی نہیں رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اللہ کی کتاب اور آپ کی سنت امت کے اندر آپ کے قائم مقام ہے، اس وجہ سے اب انھی دو چیزوں کی اطاعت آپ کی اطاعت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے خود اس کی وصیت بھی فرمادی تھی:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکم بھما کتاب اللّٰہ وسنۃ رسولہ.[3]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان دونوں پر مضبوطی سے قائم رہو گے، اس وقت تک تم گم راہ نہ ہو گے۔"

علاوہ ازیں ایک اسلامی حکومت کے وہ امرا اور حکام بھی اسی حکم میں داخل ہیں جو زمین میں خدا کی کتاب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے نافذ کرنے والے ہوں۔ اس کی تصریح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن اطاع الامام فقد اطاعنی ومن

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی

[3]۔ بخاری، کتاب الاحکام۔

عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی الامام فقد عصانی.[4]

اطاعت کی تو اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی تو اس نے میری نافرمانی کی۔"

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب و سنت کی پیروی کریں جن کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اگر محض زبان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جاتا رہے، اور اطاعت اپنی ہوائے نفس کی یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے خلاف دوسروں کی کی جاتی رہے تو اس طرح رسول کو رسول ماننا وہ ماننا نہیں ہے جس سے معرفت الٰہی کے دروازے کھلیں، بلکہ اس طرح کا ماننا الٹا آدمی کے خسران اور اس کی بدبختی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

اتباع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اتباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کے دائرہ میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر و نواہی کی ہو، لیکن اتباع کے دائرہ میں مستحبات و نوافل بھی آجاتے ہیں۔ پھر اطاعت بعض حالات میں محض ظاہری اور رسمی بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی ایک شخص کی اطاعت کرتا ہے، لیکن اس کی اطاعت میں اخلاص اور محبت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا، لیکن اتباع میں متبوع کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جانا بھی شرط ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ کی اتباع بھی کرتے تھے، وہ صرف یہی نہیں کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا حکم دیں تو اس کی تعمیل کر دیں یا کسی بات سے روکیں تو اس سے رک جائیں، بلکہ وہ آپ کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نگاہوں میں رکھتے اور پھر اس کی تقلید کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح

---

[4] ۔ مشکوٰۃ، باب الاعتصام۔

اٹھتے ہیں، کس طرح بیٹھتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، کس طرح جاگتے ہیں، کس طرح چلتے ہیں، کس طرح گفتگو کرتے ہیں، کس طرح کھانا کھاتے ہیں، کس طرح ہاتھ دھوتے ہیں، کس طرح وضو کرتے ہیں، کس طرح نماز پڑھتے ہیں؟ غرض وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حرکات و سکنات پوری نظر میں رکھتے اور پھر ان میں سے ہر شخص کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالے اور یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں، بلکہ محبت وعقیدت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباع رسول میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس ذوق وشوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعتِ رسول سے نہیں، بلکہ درحقیقت اتباع رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے، اس کی ایک ایک ادا معرفت الٰہی کا نشان ہوتی ہے، اس وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں، وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر وہ علم دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عمل دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، وہ عادات دیکھتے ہیں جو خدا کو پسند ہیں، وہ صفات دیکھتے ہیں جو خدا کو محبوب ہیں، وہ جمال دیکھتے ہیں جس پر جمالِ خداوندی کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک نقش کو تلاش کر کر کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کی محبت میں کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا صلہ یہ پاتے ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ. (آل عمران 31:3)

”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

درحقیقت رسول کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہی یہی ہے کہ معرفت الٰہی کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے اس کو رسول کی روز مرہ زندگی میں مشاہدہ کروایا جائے۔ اگر باطن میں معرفت کا نور جلوہ گر ہو تو ظاہر کی ایک ایک چیز میں جو نورانیت ہونی چاہیے، پیغمبر کی زندگی اس کا کامل نمونہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس کی زندگی کی ایک ایک ادا کو پیروی کے لیے اسوۂ حسنہ

کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، اور جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی میں جتنی ہی ترقی کرتا ہے، وہ خدا کی محبت اور اس کی محبوبیت میں اتنی ہی ترقی کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.(الاحزاب 21:33)

”تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔“

[باقی]

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(1)

واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی و علمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے، انھوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے، بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد و وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین (Intellectual) طبقہ کا تعلق ہے، اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف و مفکر ان کا مقابل و ہم سر ملے گا۔

مولانا مودودی کے بعض خیالات و تحقیقات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو (اور خود یہ ناچیز بھی ان لوگوں میں شامل ہے، جنھوں نے اس علمی محاسبہ اور تنقید کا فرض انجام دیا ہے)[1] اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تحریریں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے گہرے مطالعہ اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں، انھوں نے ایسے مبصرانہ اور جرأت مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کے علمی تحلیل و تجزیہ کا فرض انجام دیا ہے جو خود اعتمادی سے بھرپور اور مرعوبیت و سطحیت سے دور ہے، اور جس میں نام ور نو مسلم مغربی فاضل علامہ محمد اسد کے سوا ان

[1] ۔ ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ”عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح“، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

کا کوئی نظیر و ہم سر اور ان کا کوئی پیش رو (اس قریبی زمانہ میں) نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اسلام کے نظام حیات، اس کی تہذیب کی بنیادیں، حیات انسانی کی تنظیم کے اصول، اسلامی حکومت کے محاسن و خصائص اور اس کے قیام کے طریق و شرائط کو نئے اسلوب اور علمی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ (جو مغربی طرز استدلال اور جدید علمی اسلوب کا خوگر تھا) اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ انھوں نے اسلام کے حقائق، اس کے قوانین معاشرت اور اس کے اقتصادی، سیاسی نظام کو اس انداز میں پیش کیا، جس میں معذرت و تاویل کا وہ رنگ نہیں تھا، جو عرصہ سے ان مسائل پر لکھنے والے دانش وروں اور اہل قلم کے یہاں پایا جاتا تھا، بلکہ انھوں نے بارہا مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے بارے میں اقدامی پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی، جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کا وہ احساس کہتری اور شکست خوردگی دور ہو گیا جو خالص مغربی تعلیم نے ان میں پیدا کر دیا تھا، اور بہت سے نوجوانوں کے دل میں اسلام کی سربلندی اور اسلامی حکومت کے قیام کا جذبہ اور اس کی ضرورت کا احساس بیدار ہو گیا جو اس کو نا قابل عمل، بلکہ نا قابل تصور سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ ان کی وہ خدمت ہے، جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، کاش کہ وہ اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اس نقطہ پر مرکوز کر دیتے اور جیسا کہ ایک مرتبہ میں نے لاہور کی ایک مخصوص صحبت میں ان سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے فضلا اور نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کر دیتے جو ان مسائل پر پُر مغز اور فکر انگیز طریقہ پر اور یجنل (Original) لٹریچر پیش کرتی اور اس ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے راستہ میں سد سکندری بن جاتی جو سارے عالم کو اس وقت اپنے پیٹ میں لے چکا ہے اور وقت کا اہم ترین چیلنج اور اس عہد کا ''فتنۂ ارتداد'' ہے۔ انھوں نے یہ عذر کیا تھا کہ ''پتّا مارنے والے محنتی اور ذہین نوجوان نہیں ملتے''۔

یہ ایک تقدیری بات ہے کہ پاکستان پہنچنے کے بعد ان کی توانائی کا بڑا حصہ جماعت کی تنظیم و توسیع، اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبہ اور دستوری و انتخابی ذرائع سے اقتدار کو جماعت کی طرف منتقل کرنے پر مرکوز ہو گئی۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کو اپنے آخری دور میں اس کا احساس ہو گیا تھا کہ جن پیروؤں اور ہم خیالوں سے وہ اس کی توقعات وابستہ کر رہے ہیں اور جس معاشرہ کی زمین پر وہ یہ عمارت اٹھانا چاہتے ہیں، اس میں اس کا بوجھ برداشت کرنے اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ

ہونے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے، اور شاید ان کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ اس ناگزیر درمیانی منزل کے طے کرنے میں کسی قدر عجلت اور خوش گمانی سے کام لیا گیا۔ اس کو اس سے زیادہ دینی و اخلاقی تربیت اور انھی کے الفاظ میں ''سیرت سازی'' اور تعمیر کردار کی ضرورت تھی جتنی اس کو حاصل ہوئی، اس کے لیے (خواہ اس کا کچھ نام رکھا جائے، اور ''تصوف'' کے مروجہ طریقوں سے کتنا ہی احتراز کیا جائے) کسی قدر روحانی اور باطنی تربیت، ضبط نفس، ایثار و قربانی، ذوق بندگی، اور تعلق مع اللہ کی روح کی ضرورت تھی۔ اس حقیقت کے اشارے ان کے اس مشہور خیال افروز اور ولولہ انگیز مقالے میں ملیں گے جو ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' کے عنوان سے انھوں نے تقسیم سے بہت پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا تھا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے پاکستان کے انقلابات بھی دیکھے، خود اپنی جماعت کے انتشار، اس کے بنیادی ارکان کی علیحدگی اور ان کی صف آرائی کے حادثہ سے بھی بارہا دوچار ہوئے، جس سے ان دینی جماعتوں کو کم سابقہ پڑا ہوگا، جن کی بنیاد صحیح دینی وروحانی تربیت و ایثار پر پڑی اور جن کو قیادت کے لیے کوئی طاقت ور اور دل آویز دینی شخصیت حاصل ہوئی،[2] یہاں تک کہ بتدریج جماعت میں ان اہل علم حضرات میں سے کوئی نہیں رہا جو اس کے قیام و آغاز کے زمانہ سے شریک تھے، پھر بالکل آخر میں ایران کا ''اسلامی انقلاب'' کے نام سے وہ انقلاب بھی دیکھا، جو قیام حکومت اور معاشرۂ اسلامی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والوں کی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک خونی انقلاب اور ایک جذباتی رد عمل بن کر رہ گیا ہے، ان کی خداداد ذہانت اور واقعات سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت سے اس کی پوری امید ہے کہ اگر ان کو مہلت ملتی اور ان کی زندگی اور صحت ساتھ دیتی اور جماعت کی زمام قیادت ان کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ جماعت کے فکر و نظام میں

---

[2]۔ اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک و جماعت کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جن کی دعوت آخری درجہ کے مالی و جانی ایثار اور راہ خدا میں جاں نثاری و سرفروشی پر مبنی تھی، اس کے باوجود ایک شخص نے بھی آخر دم (معرکہ بالاکوٹ) تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا، اور جو اس شہادت زار سے زندہ واپس آئے وہ آخری سانس تک ان کا دم بھرتے رہے، اور اسی راہ پر گام زن رہے 'مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا'۔

بڑی اہم اور دور رس تبدیلیاں کرتے اور افراد جماعت کی اصلاح و تربیت میں بعض مؤثر قدم اٹھاتے، اور ''اسلامی حکومت'' کے بجاے ''اسلامی معاشرہ'' کے قیام پر اپنی توجہ کا بڑا حصہ مرکوز کر دیتے۔ جولائی 1978 کے آخری ہفتہ میں جب میری ان سے لاہور میں آخری ملاقات ہوئی اور میں نے ہندوستان میں ''پیام انسانیت'' کی تحریک اور پاکستان میں بھی اسی کے مماثل کسی تحریک کی ضرورت کا ذکر کیا اور معاشرہ کی اخلاقی گراوٹ اور زبوں حالی کا تذکرہ کیا تو انھوں نے اس کی تحسین فرمائی اور تائید وہمت افزائی کے کلمات کہے۔

ان چند ''سخن گسترانہ'' باتوں کے باوجود جو بہر حال اندازوں اور تمناؤں پر مبنی ہیں، اس میں شک نہیں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے اور اس کے دلوں میں اسلام کی طرف سے اعتماد بحال کرنے میں ان کے قلم نے جو خدمت انجام دی وہ ہر شبہ اور اختلاف سے بالاتر ہے، اور عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدید تحریک اور جدوجہد کی تاریخ میں ناقابل انکار اور ناقابلِ فراموش ہے۔

مجھے مولانا کی شخصیت اور تحریروں سے واقفیت کی سعادت 35-1934ھ ہی سے حاصل ہو گئی تھی، جب دار العلوم ندوۃ العلما میں میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، میں نے ان کی کتابوں اور تحریروں سے بہت استفادہ کیا اور میری تحریر میں اس کا رنگ آیا۔ یہ میرا عنفوان شباب تھا،[3] اسی زمانہ میں ان کے شہرۂ آفاق رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں میرا ایک مضمون سورۂ کہف کی تفسیر کے بعض اشارات پر شائع ہوا[4] جو مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بہت پسند کیا۔ اس وقت مولانا حیدر آباد میں تھے اور ''ترجمان القرآن'' وہیں سے نکلتا تھا، دوسرا ''دین وسیاست'' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوا۔ میری پہلی ملاقات ان سے لاہور میں اگست 1939 کی کسی تاریخ میں ہوئی۔ میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ایک دینی مہم اور تلاش کے سلسلہ میں بلوچستان کا سفر کر رہے تھے، اس ملاقات میں مولانا نعمانی اور مولانا حبیب اللہ صاحب (فرزند اکبر حضرت مولانا احمد علی لاہوری) بھی ساتھ تھے، مجھے یاد ہے کہ ملتے ہی مولانا نے کہا'' آج

---

[3]۔ میری عمر اس وقت بیس سے کچھ ہی اوپر تھی۔

[4]۔ انھی اشارات کی مدد سے میں نے اپنی کتاب ''معرکۂ ایمان ومادیت'' تصنیف کی۔

قران السعدین ہی نہیں قران السعداء ہو گیا"۔

میری مولانا سے خط و کتابت غالبا اگست 1940 سے شروع ہوئی، میں رفیق محترم مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کے ساتھ "الندوہ" کا ایڈیٹر تھا، ہم لوگوں نے اس میں ایک سلسلہ "میری محسن کتابیں" کے نام سے شروع کیا، جس میں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم و اہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ افادۂ عام اور "تازہ واردانِ بساط علم" کی رہنمائی کے لیے ان کتابوں کا ذکر کریں جنھوں نے ان کے ذہن کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے، اور ان کے دماغ پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ میں نے مولانا کو بھی دعوت دی، اس سلسلہ میں ان کا جو جواب آیا وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ یہ ان کے مطالعہ کا نچوڑ اور خود ان کی سوانح و سیرت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے مجھے 31 اگست 1940 کو ایک مفصل خط لکھا جس میں مجھ سے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "پردہ" کے عربی ترجمہ کا انتظام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے لکھا کہ:

"میری دلی خواہش ہے کہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہو جائے، تاکہ ممالک عربیہ خصوصاً مصر میں اس کی اشاعت کی جاسکے۔ ندوہ کے سوا کسی اور مرکز کی طرف نظر نہیں جاتی، یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو وہیں ہو سکتا ہے۔ براہ کرم آپ کسی ایسے صاحب کو اس کام پر مامور فرمائیں جو جیتی جاگتی زبان میں اسے منتقل کر سکیں۔"

اس کے بعد میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"کچھ مدت ہوئی آپ کا ایک عنایت نامہ آیا تھا، جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ وہ کتابیں جن کا ممنون ہوں یا "میری محسن کتابیں" کے عنوان پر کچھ لکھوں، میں اس کا جواب دینا بھول گیا، ابھی آپ کو خط لکھتے ہوئے اس کا خیال آیا۔

جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے، قدیم وجدید فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بہ خدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں، بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں

الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے، ان کو اس کتاب نے ایک دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے ؟ میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے، اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے، گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کو کنجی شاہ کلید (Master Key) کہتے ہیں، جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لیے یہ قرآن شاہ کلید ہے۔ مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے، اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ"

مولانا سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب مولانا اس کمیٹی میں شرکت کے لیے لکھنؤ تشریف لائے جو اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لیے نواب سر احمد سعید آف چھتاری کی دعوت پر ندوۃ العلما میں منعقد ہو رہی تھی۔ مولانا نے اپنی آمد سے پہلے مجھے اپنی تشریف آوری کی اطلاع دی اور اپنے قیام کا مجھے ذمہ دار بنایا۔ اس وقت ان کا 24 دسمبر 1940 کا ایک خط سامنے ہے جو ایک اہم تاریخی یادگار کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور 24 دسمبر 1940

مکری و محترمی۔ السلام علیکم

عنایت نامہ ابھی ملا اور آج ہی اتفاق کی بات ہے، نواب صاحب چھتاری کا خط آیا جس میں انھوں نے ایک کمیٹی کی شرکت کے لیے مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہے... ان نوابوں اور ان کی کمیٹیوں سے تو مجھے کوئی دل چسپی نہیں، اور اگر محض ان کی کمیٹی کی شرکت کا معاملہ ہوتا تو میں ٹال دیتا، مگر اس بہانے ندوہ سے اور آپ کے رفقائے کار سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا ایک موقع ہاتھ آتا ہے، اس لیے میں نے لکھنؤ حاضر ہونے کا تہیہ کر لیا ہے... میں انشاء اللہ 3 جنوری کو لکھنؤ پہنچوں گا، میرے قیام کے لیے کوئی مناسب انتظام کرنا آپ کا ذمہ ہے، میں کسی

ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتا ہوں جہاں ہر قسم کے لوگ مجھ سے مل سکیں اور آزادی کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔ علی گڑھ میں میں نے اولڈ بوائز لاج کو پسند کیا تھا، اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ہر خیال اور ہر گروہ کے آدمی مجھ سے بے تکلف ملے۔ ایسی ہی کوئی جگہ میں لکھنؤ میں چاہتا ہوں۔ میں چونکہ بے ہمہ ہوں اس لیے خدا نے مجھے باہمہ بھی بنا دیا ہے، سخت قسم کے دہریہ اور کمیونسٹ بھی مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں، جس طرح مومنین صادقین، اور ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں ایسی جگہ آسانی ہوتی ہے، جہاں وہ شخصیتیں نہ ہوں جن سے یہ لوگ تکلف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

رسالہ[5] کے متعلق انشاء اللہ وہیں بالمشافہ گفتگو ہو گی۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ"

مولانا جنوری 1941 کے پہلے ہفتے میں لکھنؤ تشریف لائے، یہ زمانہ مسلمانوں میں ایک طرف کانگریس کی تحریک (جس کی قیادت جواہر لال نہرو کر رہے تھے) کے زور، دوسری طرف پاکستان کا نعرہ بلند ہو جانے کی وجہ سے بڑی بے چینی اور جوش و سرگرمی کا تھا۔ مولانا کے پُر زور، فکر انگیز مضامین اور "ترجمان القرآن" کے مقالات نے اسلامی حلقوں میں ایک جنبش اور حرکت پیدا کر دی تھی۔ نوجوان اسلام کی اس ترجمانی کے دل دادہ تھے، جو بلند سطح سے اور پُر از اعتماد لہجہ میں کی جائے اور مسلمانوں میں امنگ، حوصلہ اور اپنے ماضی اور تہذیب پر اعتماد پیدا کرے۔ مولانا کا قیام دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ہوا، جہاں استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد سبحانی مقیم تھے۔ یونیورسٹی کے مسلمان طلبا اور شہر کے صاحب فکر مسلم نوجوان جوق در جوق آتے اور مولانا سے بڑے ذوق و عقیدت سے ملتے۔ ایسے موقع پر مولانا ان کو لے کر مسجد میں جا بیٹھتے، جو مہمان خانہ سے متصل ہے۔ ندوہ کی طرف سے میں ان حضرات کی میزبانی اور رفاقت پر مامور تھا اور مولانا لکھنؤ کے احباب میں مجھ سے زیادہ مانوس اور واقف تھے، اس لیے مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا اور زیادہ سے زیادہ رہنے کا موقع ملا۔ میں مولانا کی سنجیدگی... نستعلیقی، اسی کے ساتھ طبیعت کی شگفتگی، اخلاق اور اپنے مقصد کی لگن سے بہت متاثر ہوا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم

---

[5]۔ عربی رسالہ کا اجرا جو فکر اسلامی و دعوت کا آرگن بن سکے، آگے اس کی تفصیل آئے گی۔

ہو گا کہ مولانا بڑا لطیف مزاج فرماتے تھے اور طبیعت میں ظرافت تھی... جو زباں دانی اور دہلوی مذاق سلیم کے ساتھ مل کر بڑی لطافت پیدا کر دیتی، خشکی ان میں نام کو نہ تھی، اور وہ جلد بے تکلف ہو جاتے۔ مولانا چند دن قیام کر کے واپس گئے، لیکن خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

[باقی]

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(5)

[صاحب تدبر قرآن کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

آزادیِ فکر

مدرسۃ الاصلاح کی ایک نمایاں خصوصیت جس کا مولانا امین احسن اصلاحی پر بطور خاص اثر تھا، وہاں پر فروغ پانے والی آزادیِ فکر کا کلچر ہے۔ جیسا کہ نصاب کے حوالے سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید پورے کا پورا نصاب کا حصہ تھا اور اس کو براہ راست سمجھنے کی اہلیت پیدا کی جاتی تھی اور کوئی بھی تفسیر حتیٰ کہ خود امام فراہی کی تفسیر بھی اس کا حصہ نہیں تھی۔ واضح رہے کہ یہ اس لیے تھا کہ طلبہ کسی بھی قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر دین کے محقق عالم بن سکیں۔ اس حوالے سے خود مولانا اصلاحی ماہنامہ ''اصلاح'' کے اگست 1936 کے شمارے کے ادارتی شذرے میں لکھتے ہیں:

''ہمارا یہی معاملہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے ساتھ ہے۔ ان کا علم و تبحّر مُسَلَّم، ان کا درجۂ اجتہاد اور رتبۂ امامت مسلم، ان کا زہد و تقویٰ بھی مسلم، لیکن ان کے معصوم

ہونے کے ہم قائل نہیں ہیں۔ ان کی تصنیفات میں وہ تمام کم زوریاں ہو سکتی ہیں جو مصنفوں کی کتابوں میں ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ وہ مصنف محقق تھے، معصوم نہیں تھے۔ ہم لوگوں کی نظر میں ان کی بہت عزت ہے۔ اس لیے کہ وہ علم و عمل کی 'جامعِیَّت' کے اس دور میں بہترین نمونہ تھے۔ انھوں نے اپنی ایک ذات کے اندر علوم و فنون کی اتنی شاخیں جمع کر لی تھیں جن کی کوئی دوسری مثال ان کے ہم عصروں میں نہیں تھی۔ پھر علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیقِ عمل سے نوازا تھا۔ اور یہ چیز ان کے ہر قول و عمل میں اس قدر نمایاں تھی کہ ہر صاحب نظر صرف ایک دفعہ دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن ہم نے 'اربباً مِن دونِ اللہ' کی حیثیت دے کر ان کے ہر قول و فعل کو اپنے لیے ''اُسوہ'' بنانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ زندہ تھے تو ان کی مجلسوں میں ان کی تحقیقات پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے۔ (اگر گنجایش دیکھتے تھے) اور ان کی وفات کے بعد ان کی تحقیقات پر اسی طرح بحث و نظر کرتے ہیں جس طرح تمام محققین کی تحقیقات پر۔ انھوں نے کبھی ''لَب بند و گوش بند'' کی تلقین نہیں کی۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ غور و فکر کرو اور اپنے دروس میں اسی کا طریقہ بتاتے تھے۔ وہ جب اس چیز میں ہمارے اندر کوئی کم زوری محسوس کرتے تو ان کو بہت مایوسی ہوتی۔ مگر انھوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ سب میرے مقلد بن جائیں۔ اور اگر وہ یہ چاہتے تو یقیناً مدرسۃ الاصلاح میں ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوتی۔ پس اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہم مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ کی ہر رائے کو اور ہر بات کو صواب اور ہر تصنیف کو الہامی سمجھتے ہیں تو ہم اس کی نسبت یہی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے حال سے بے خبر ہے۔''(4-3)

مولانا نے اپنی زبانی روایت میں متعدد بار یہ قصہ سنایا کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک طالب علم کسی علمی موضوع پر کسی دوسرے صاحب علم کی رائے پوچھنے اور سمجھنے آیا۔ مولانا فراہی نے تفصیل سے اُس صاحب علم کی رائے بیان کر دی۔ مولانا فراہی نے یہ رائے اس قدر مدلل طریقے سے بیان کی کہ وہ طالب علم یہ سمجھا کہ مولانا کی بھی یہی رائے ہے۔ اور اس نے یہ رائے دوسری جگہ ان کے نقطۂ نظر کے طور پر بیان کر دی۔ جب مولانا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی تردید کی اور کہا کہ میں نے تو ان کی رائے کے وہ دلائل بتائے تھے جو ان کی رائے کے حق میں ہو سکتے تھے۔ اس پر طلبہ نے پوچھا کہ پھر آپ کی رائے اس معاملے میں کیا ہے؟

مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ آپ کو اس رائے پر کیا اعتراض ہے؟ جب تک آپ اس رائے کی کم زوری اور نقص تک خود نہیں پہنچ جاتے میں دوسری رائے بیان نہیں کروں گا۔

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ اس سے طلبہ کی یہ تربیت ہوئی کہ وہ استاذ کی تقلید میں نہیں اپنے غور و خوض سے درست رائے پر پہنچیں۔ مولانا بتاتے ہیں کہ یہ ان کے استاد کی مستقل عادت تھی کہ وہ سائل کو اسی وقت اپنی رائے سے آگاہ کرتے جب تک وہ یہ نہ بتا دیتا کہ اس معاملے تمام آرا کے اندر یہ اور یہ نقائص پائے جاتے ہیں اور اب وہ کسی نئی رائے جاننے کا حقیقی ضرورت مند ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کی ادبی فضا

مدرسۃ الاصلاح کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ تدریسی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ طلبہ ادب و شاعری کو اختیار کرنا بڑا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ بڑی واضح تھی۔ کلاسیکی شاعری ان کے نصاب میں شامل تھی اور مدرسے کے بانیان خود اعلیٰ پائے کے ادیب اور شاعر تھے، اس لیے ان کی اقتدا میں ادب کی ہر صنف کی طرف ان کا راغب ہونا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں وہی طلبہ آگے بڑھتے جن کے اندر اس کی فطری صلاحیت اور رجحان ہوتا۔ امین احسن بتاتے ہیں کہ مدرسے میں شاعری کی فضا تھی اس لیے انھوں نے بھی شعر کہنا شروع کیا۔

اس میدان میں بھی ان کے آئیڈیل امام فراہی اور شبلی نعمانی تھے۔ امام فراہی فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے، لیکن انھوں نے اسے اپنا میدان بنایا اور نہ اپنے کلام کو مدون کرنے کی کوئی کوشش کی۔ البتہ ان کی زندگی کے بعد ان کا عربی اور فارسی کلام مدون صورت میں بھی سامنے آیا۔ اس کے مقابلے میں علامہ شبلی کا معاملہ دوسرا تھا۔ ان کے اشعار تو زبان زد عام تھے۔ امین احسن بتاتے ہیں کہ انھوں نے اردو میں شاعری شروع کی، لیکن جلد ہی انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ ان کا میدان نہیں۔

اپنی زبانی روایت میں انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ لوگ میری شاعری کیوں پڑھیں؟ کیا یہ غالب و شبلی سے بہتر ہے؟ اگر یہ اس سے بہتر نہیں ہے تو لوگوں کا وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کو ہمیشہ کے لیے ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے وہ ایک معرکہ سر انجام دے چکے تھے۔

استاد کی ہجو اور جرمانے کی سزا

امین احسن اپنے تاثرات بیان کرنے میں کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیتے تھے۔ ہوا یہ کہ انھیں اپنے ایک استاد سے ایک ایسی شکایت پیدا ہوئی جس میں دوسرے طالب علم بھی ان کے موقف کے قائل تھے۔ بس پھر کیا تھا، انھوں سب کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان پر ایک نظم کہہ ڈالی۔ یہ نظم اصل میں ہجو تھی۔ نظم بہت اچھی تھی اور سب کو پسند آئی۔ سارے مدرسے میں اس کا چرچا تھا۔ یہاں تک کہ صدر مدرسہ امام فراہی تک جا پہنچی۔ انھوں نے امین احسن کو طلب کیا اور استاد پر اس طرح کے منظوم تبصرے کو احترام استاد کے خلاف قرار دیا۔ امین احسن کو جرمانہ بھی کیا گیا اور نصیحت بھی کہ اس طرح کی حرکت کسی طور مناسب نہیں۔ البتہ اس نظم پر یہ تبصرہ بھی کیا کہ یہ نظم بہت اعلیٰ تھی۔

یہ نظم کس استاد پر تھی، اس کا ذکر مولانا امین احسن نے کبھی نہیں کیا۔ اور اس نظم کے ایک بھی شعر کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ مولانا کے اس طرز عمل کی وجہ سے ہم نے اس کا کھوج لگانے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس واقعے سے ہمیں مدرسۃ الاصلاح کی ایک اور خوبی کا بھی علم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اخلاقی کم زوری کے معاملے میں مدرسے میں کسی قسم کی رعایت روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس حوالے سے ایک مزید واقعے کی مثال دی جاتی ہے۔

''ذکر فراہی'' میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی امین احسن ہی کے دور طالب علمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک طالب علم حکیم عبدالقیوم ندوی کے ساتھ کچھ طالب علموں نے ایک شرارت کی۔ انھوں نے ایک بلی مار کر اسے ایک دوسرے طالب علم قاسم علی کی چارپائی پر پھینک دیا۔ قاسم علی اٹھا تو سخت گھبرایا۔ اسے یہ باور کرایا گیا کہ یہ حرکت عبدالقیوم کی ہے۔ قاسم علی ایک کھاتے پیتے باپ کا نک چڑھا بیٹا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، الزام ہی کو سچ مان لیا اور عبدالقیوم کو خوب مارا۔ وہ بے چارا واویلا کرتا رہا کہ وہ سراسر بے قصور ہے، لیکن قاسم علی طاقت میں بھی بڑھ کر تھا اور اسے باپ کا گھمنڈ بھی تھا۔

یہ وہ دن تھے جب امام فراہی مدرسے کے پرنسپل تو تھے، لیکن ابھی وہ مدرسے میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے۔ وہ تین دنوں کے لیے مدرسے آتے تھے اور آج خوش قسمتی سے انھوں نے

اعظم گڑھ آنا تھا۔ عبدالقیوم ریلوے اسٹیشن ہی جا کر کھڑا ہو گیا اور امام فراہی کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ اسٹیشن پہنچے اس نے رو رو کر اپنے اوپر ہونے والی ظلم کی داستان سناڈالی۔

امام فراہی نے انھیں انصاف کی یقین دہانی کرائی۔ معاملے کی تحقیق پر واضح ہو گیا کہ یہ حرکت عبدالقیوم کی نہیں اور قاسم علی نے اپنی رعونت کی وجہ سے مار پیٹ کی ہے۔ امام فراہی نے فوراً نگران کو طلب کیا۔ اور اسے پوچھا کہ یہ مقدمہ میرے پاس کیوں آیا ہے؟ اس کی تحقیق آپ کی ذمہ داری تھی۔ اور آپ نے قاسم سے پوچھ گچھ کرنے کے بجائے اس پر خاموشی کیوں اختیار کی؟

قاسم علی پر واضح کیا گیا کہ آپ کا اپنے والد کا طعنہ دینا سخت معیوب ہے۔ یہ مدرسہ کسی دولت مند کے تعاون سے نہیں مسلمانوں کے تعاون اور اللہ کی توفیق سے چلتا ہے۔ آپ کو ہوسٹل سے فوراً خارج کیا جاتا ہے۔ آپ صرف غیر اقامتی طالب علم کے طور پر یہاں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ جب کہ نگران استاد کو یہ سزا دی گئی کہ اس کے مہینے بھر کی تنخواہ سے عبدالقیوم کو دودھ پلایا جائے گا۔(414)

سب سے پسندیدہ استاد

دوران تعلیم جس استاذ سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ مولوی عبدالرحمان نگرامی تھے۔ انھیں علامہ شبلی نعمانی، امام فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و فکری صحبت حاصل رہی۔ بتایا جاچکا ہے کہ انھیں بطور خاص امام فراہی نے مدرسۃ الاصلاح کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مدرسۃ الاصلاح میں جس استاد نے مستقبل کے امین احسن کو پہچانا، وہ مولانا نگرامی ہی تھے۔ انھوں ہی نے اپنے ہونہار اور ذہین شاگرد کی وہ علمی کم زوریاں دور کیں جو ان کے اولین اساتذہ کے طریقۂ تدریس کے ساتھ عدم مناسبت کی وجہ سے رہ گئی تھیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مولانا نگرامی ہی نے امین احسن کو اس قابل بنایا کہ وہ امام فراہی کے کڑے معیار پر پورا اتر کر ان کی علمی میراث کے امین بن سکیں۔ خود امین احسن اپنے اس استاد سے بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ امین احسن کے گہرے تعلقات قائم ہوئے۔ چنانچہ ہم اساتذہ کے تعارف میں ان کا بطور خاص تذکرہ کریں گے۔

سب سے اچھے دوست اور ہم جماعت

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امین احسن اپنے ہم جماعتوں میں سب سے چھوٹی عمر کے تھی۔ ان سے کچھ بڑی عمر مولوی اختر احسن کی تھی۔ وہی امین احسن کے سب سے اچھے دوست تھے۔ دوران تعلیم ان کے ساتھ ایک مقابلے کی فضا رہی۔ لیکن سب سے گہری اور بااعتماد دوستی بھی انھی کے ساتھ تھی۔ امین احسن انھیں دوران تعلیم اپنا برتر ہم جماعت سمجھتے اور ان سے طالب علمانہ استفادہ بھی کرتے۔ یہ دوستی اس وقت بہت مضبوط اور برادرانہ تعلق میں ڈھل گئی جب امین احسن بطور استاد مدرسہ سے وابستہ ہوئے۔ (اس کا تفصیلی حال آگے آرہا ہے۔)

کھیل کے میدان میں

مدرسے میں مولانا کے مطابق تین کھیل باقاعدگی سے کھیلے جاتے تھے۔ کرکٹ، والی بال اور فٹ بال۔ امین احسن ان سب میں حصہ لیتے، لیکن وہ کبھی بھی اچھے کھلاڑی نہیں رہے۔ مولانا بتاتے ہیں کہ ان کے ہم جماعت کبھی بھی خوش دلی سے انھیں اپنی ٹیم کا حصہ نہیں بناتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی کارکردگی سے کبھی کوئی ٹیم مقابلہ نہ جیت سکی تھی۔ ان کی کھیل میں مہارت متوسط سے بھی کم تر ہوتی۔ انھیں ان کی متاثر کن تعلیمی قابلیت کے ”رعب“ کی وجہ سے ساتھ رکھا جاتا۔ بقول مولانا ان کے ہم جولی ”ترس کھا کر“ انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ مولانا کے مطابق باقی کھیلوں کی نسبت انھیں کرکٹ سے کچھ دل چسپی ضرور تھی، لیکن یہ بھی بہت واجبی تھی۔

مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم کی تکمیل

امین احسن نے مدرسے میں پورے آٹھ برس تعلیم حاصل کی۔ یہی مدرسے کی پوری مدت تدریس تھی۔ اس دوران میں انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں مہارت حاصل کی۔ کلامی علوم کی تعلیم سے بھی بہرہ مند ہوئے۔ انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ علمی کتب کو اچھی طرح سے سمجھ سکتے تھے۔ نہ صرف سمجھ سکتے تھے، بلکہ اسے پڑھا بھی سکتے تھے۔

فقہ اور تفسیر میں انھیں کسی خاص مکتبۂ فکر کی تعلیم نہیں دی گئی۔ مدرسے کی اصولی تعلیم کے مطابق ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی گئی کہ وہ خود ترجیح قائم کریں اور اپنے دلائل کی بنیاد پر کسی

بھی رائے کے ردو قبول کا فیصلہ کر سکیں۔ دوران تعلیم امین احسن کا شمار مدرسے کے لائق ترین، متحرک اور چوٹی کے طلبہ میں ہوتا تھا۔ اس کی شہادت متعدد واقعات سے ملتی ہے۔ یہاں مزید دل چسپ واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

عربی زبان کے مضمون میں ''سبع معلقات'' کا امتحان ہوا۔ سید سلیمان ندوی ممتحن تھے۔ امین احسن نے پرچہ حل کیا۔ وہ ان کے جوابات سے بہت متاثر ہوئے۔ اس پرچے پر لکھا:

''یہ ایک طالب علم کا پرچہ ہے۔ مجھے ''ندوہ'' کے لیے اس طرح کے استاد بھی کہاں سے ملیں گے۔''

یاد رہے علامہ شبلی نعمانی کے جید شاگرد سید سلیمان ندوی جامعہ ندوۃ العلما کے مشہور اساتذہ میں سے ایک تھے۔

مدرسے میں ان کی علمی قابلیت کے بارے میں جاوید احمد غامدی بیان کرتے ہیں:

''انگریزی زبان میں اُن کی استعداد اتنی اچھی تھی کہ علوم عالیہ کی کتابیں اِس زبان میں نہ صرف یہ کہ بغیر کسی دقت کے پڑھتے، بلکہ اُن کے اَدَق مطالب دوسروں کو سمجھا دے سکتے تھے۔ دینی مدارس کے طلبہ بالعموم عربی بولنے پر قدرت نہیں رکھتے، لیکن وہ جب امام فراہی سے استفادے کے لیے اُن کے پاس مقیم تھے تو بے تکلف عربی بولتے تھے۔ مشہور عالم موسیٰ جار اللہ ہندوستان آئے تو امام فراہی سے ملنے مدرسۃ الاصلاح بھی گئے۔ امین احسن ہی اُن کے میزبان تھے۔ عربی زبان میں گفتگو اور تقریر پر اُن کی قدرت دیکھ کر ایک دن اُنھوں نے پوچھا: عرب میں کتنے سال گزار کر آئے ہو؟ امین احسن نے جواب دیا: 'ما مست قدمی هاتین قط بلاد العرب' (میرے اِن دونوں پاؤں کو کبھی سرزمین عرب نے نہیں چھوا)۔ موسیٰ جار اللہ بڑی دیر تک اپنی حیرت کا اظہار کرتے رہے۔'' (اشراق: دسمبر، جنوری 1998)

امین احسن خود بتاتے ہیں کہ انھوں نے 1922 میں مدرسۃ الاصلاح میں اپنی تدریس مکمل کی۔ (مقالات اصلاحی 2/396)

رشتۂ ازدواج

امین احسن ابھی مدرسۃ الاصلاح میں آخری برس کے طالب علم تھے کہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ امین احسن کی پہلی شادی اپنے ہی راجپوت خاندان میں رابعہ خاتون سے ہوئی۔ ان

سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے۔ قمر النساء اور شمس النساء ان کی بیٹیوں کے نام ہیں۔ بڑی بیٹی شمس النساء تقسیم سے پہلے ہی انتقال کر گئیں۔ ابو صالح، ابو سعید اور ابو سعد ان کے بیٹوں کے نام ہیں۔ تادم تحریر صرف ابو سعید حیات ہیں۔ ابو سعد نے تقسیم کے بعد ہندستان ہی میں اعظم گڑھ رہنے کو ترجیح دی۔ ان کی وفات وہیں ہوئی۔ مولانا کے بیٹوں میں ابو صالح کا شمار پاکستان کے نامور صحافیوں میں ہوتا تھا۔ وہ 1965ء کے مشہور فضائی حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ (ان کا تفصیلی تذکرہ اپنی جگہ پر آئے گا۔ ان شاءاللہ) مولانا کی دوسری شادی ان کی پہلی بیگم کی وفات کے بعد 1945ء میں ہوئی۔ اس کا ذکر بھی اپنے مقام پر آئے گا۔

عملی زندگی کا آغاز

جس برس امین احسن مدرسۃ الاصلاح کی تدریس سے فارغ ہوئے، اسی برس اخبار میں ایک اشتہار آیا۔ یہ بجنور کے معروف سِہ روزہ اخبار 'مدینہ' میں نائب مدیر کی اسامی کا اشتہار تھا۔ مولانا امین احسن کے معتمد ترین شاگرد جناب خالد مسعود روایت کرتے ہیں کہ امین احسن کے کسی بے تکلف دوست نے شرارتاً اس کے لیے ان کی طرف سے درخواست بھیج دی۔ اس کا جب مثبت جواب آیا تو امین احسن حیران رہ گئے۔ اس وقت ان کی عمر محض اٹھارہ انیس برس تھی۔ قرین قیاس یہی ہے کہ اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی۔ امین احسن نے اپنے سب سے پسندیدہ اور مربی استاد عبدالرحمان نگرامی سے مشورہ کیا کہ انھیں کیا کرنا چاہیے؟

امین احسن نے استاد کے مشورے کے مطابق اس اخبار میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس اخبار کی کچھ تفصیل ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

سہ روزہ مدینہ 1912ء میں مولوی مجید حسن نے بجنور سے نکالا تھا۔ یہ 26×20 کی تقطیع پر دس صفحات پر مشتمل اخبار تھا۔ اس کے بارے میں ایک کتاب "دروس التاریخ" کے پہلے حصے کے آخری صفحے پر اس کا ایک اشتہار ملتا ہے، جس میں لکھا ہے:

> "1912ء سے شہنشاہِ کونین کی یاد تازہ رکھنے کے لیے قابل اور اہلِ قلم ایڈیٹروں کی زیرِ ادارت جاری ہے۔ بفضلہٖ ہفتے میں دو بار اپنے کثیر التعداد معاونین کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ خدمتِ قوم و ملک، پاسداریِ مذہب و ملت اس کا شعار، آزادیِ وطن و قومی مطالبات کا علم بردار،

سیاستِ حاضرہ کا مفسر، حق و صداقت کا شہر، عربی و انگریزی اخبارات کا خلاصہ، مصری، شامی و ترکی جرائد کی روح، دنیا کے ہر گوشے میں پہنچنے والا، ملاحظہ و مطالعہ خود ہمارے بیان کی تصدیق کرے گا۔ طلب فرما کر ملاحظہ کیجیے۔ قیمت سالانہ چھے روپے، ششماہی چار روپے، سہ ماہی دو روپے۔ ممالکِ غیر سے آٹھ روپے۔

محمد مجید حسن، مالک اخبار مدینہ بجنور (یوپی)"

ڈاکٹر محمد ہارون عثمانی اپنے مقالے "مولانا امین احسن اصلاحی کی صحافتی خدمات" میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مطابق یہ ایک ثقہ قسم کا نیشنلسٹ سہ روزہ تھا اور اس کے خیالات سے بہت سے لوگوں کو اختلاف رہا ہے لیکن اس کی ثقاہت، سنجیدگی اور بلند معیاری سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ (صحافت پاکستان اور ہند میں۔ لاہور، مکتبۂ کارواں 1982ء صفحہ 187)

رئیس الدین فریدی نے مدینہ بجنور سے وابستہ مدیروں کے نام گنوائے ہیں جن میں حامد الانصاری غازی، نصر اللہ خاں عزیز، ابو سعید بزمی بھوپالی، قاضی عدیل احمد عباسی، بدر الحسن حلالی، محمد احسن اور قدوس صہبائی شامل ہیں۔ امین احسن کا نام یہاں یا کسی اور صحافتی تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نائب مدیر تھے اور نو آموز۔ مزید یہ کہ انھوں نے زیادہ تر تراجم کرنے، مضامین لکھنے اور پروفنگ کا کام کیا تھا۔ اس حوالے سے وہ خود کہتے ہیں:

"'مدینہ' سے میرا تعلق غالباً 1922ء میں قائم ہوا۔ یہ اس زمانے میں یوپی کے سہ روزہ اخباروں میں سے ایک اچھا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ یہ زمانہ تحریکِ خلافت اور کانگریس، دونوں کی سرگرمیوں کا تھا اور دونوں کچھ ملی جلی چل رہی تھیں اور مدینہ اخبار دونوں کا ہم نوا تھا۔ اس وجہ سے مجھے بھی مضامین ان دونوں کے تقاضوں کے مطابق لکھنے پڑتے تھے۔"

اس ادارے سے "غنچہ" کے نام سے بچوں کے لیے ایک ہفت روزہ بھی شائع ہوتا۔ امین احسن کو اس کی ذمہ داریاں بھی دے دی گئیں۔ ہفت روزہ غنچہ ہی کے لیے انھوں نے عربی ناول کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس ناول کا نام "الجاسوس الہندی" تھا۔ اس کے مصنف مصطفیٰ الصغیر تھے۔ یہ جنگ عظیم اول کے پس منظر میں لکھا گیا ناول تھا۔ اس میں ایسے جاسوس کے کارنامے بیان کیے گئے تھے جو خلافت عثمانیہ کے حق میں انگریزوں کے خلاف ایک اہم مہم سر کرتا ہے۔ اس کی ایک ریکارڈ کی کاپی ہم نے اپنے خسر جناب خالد مسعود مرحوم کے ہاں دیکھی تھی۔ اس کی سب سے

بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ اس کی تحریر ترجمہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ امین احسن نے اس کا نام ''ہندستانی جاسوس'' رکھا تھا۔ ہفت روزہ غنچہ میں یہ تحریر بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ قارئین کی پسندیدگی کی وجہ سے اسے مدینہ بجنور کے مکتبہ نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ یہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف بھی کہلاتی ہے۔

اسی مکتبہ سے امین احسن نے عربی زبان میں لکھی گئی تاریخ کی ایک جید کتاب کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ مشہور مورخ محی الدین الخیاط کی تصنیف تھی۔ اس پہلی ملازمت کے دوران میں امین احسن کی تحریروں نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ انھوں نے مدینہ اخبار کی تحریروں کو دیکھ کر یہ تبصرہ کیا:

''اخبار مدینہ کو ایک نابالغ مدیر میسر آگیا ہے۔''

اس تبصرے کو مثبت معنی میں لیں یا اسے طنزیہ کہیں، لیکن ایک بات اس سے واضح ہوتی ہے کہ نوجوان امین احسن نے اپنے دور کے سب سے نامور ادیب کو ضرور اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

امین احسن کم از کم ڈھائی برس تک مدینہ اخبار سے وابستہ رہے۔ اس دوران میں انھوں نے دن رات کام کیا۔ کام کی زیادتی نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر کیا۔ چنانچہ انھوں نے اخبار سے استعفا دے دیا۔

''الناظر'' سے وابستگی

ان کی صحافتی زندگی کا اگلا پڑاؤ مشہور اخبار ''الناظر'' تھا۔ امین احسن اس کی مجلس تحریر میں شامل ہو گئے۔ اس اخبار میں اس وقت کے دو نام ور ادیب پہلے سے موجود تھے۔ ایک مولانا عبد الماجد دریابادی اور دوسرے مولانا ظفر الملک علوی۔ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے ان کی تحریروں میں مزید پختگی پیدا ہوئی۔ تقریباً ایک برس کے بعد وہ ''الناظر'' سے علیحدہ ہو گئے۔ (بحوالہ ماہنامہ چراغ راہ، جولائی 1950، صفحہ 17، تحریر ابن انوار)

اس علیحدگی کا باعث غالباً ایک نئے ہفت روزہ سے تعلق تھا۔

ہفت روزہ ''سچ'' سے وابستگی

کوچۂ صحافت میں امین احسن کی تیسری ملازمت ہفت روزہ ''سچ'' کی مجلس ادارت میں شمولیت

ہے۔ یہ ہفت روزہ مولانا عبد الماجد دریابادی نے 1925ء میں شروع کیا۔ اس میں مولانا عبد الرحمان نگرامی بھی شامل تھے۔ گمان غالب ہے کہ انھی کے مشورے پر امین احسن ہفت روزہ ''سچ'' میں آئے ہوں گے۔ ہفت روزہ ''سچ'' کے بارے میں ڈاکٹر عبد السلام خورشید لکھتے ہیں:

''آخر میں ایک چھوٹے سے، لیکن نہایت اہم ہفت روزہ کا ذکر ضروری ہے۔ اس کا نام پہلے 'سچ' تھا پھر 'صدق' ہوا اور کچھ عرصے بعد دوبارہ جاری ہوا تو 'صدق جدید' کے نام سے مشہور ہوا۔'' (صحافت پاکستان اور ہند میں، ڈاکٹر عبد السلام خورشید، صفحہ 251)

امین احسن کو یہاں چند ماہ بعد ہی کام کا موقع ملا۔ اس کے بعد وہ واقعہ ہو گیا جس نے ان کی زندگی کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ قبل اس کے کہ ہم مولانا کی زندگی کے اس اہم ترین واقعے کا ذکر کریں، ایک اور حقیقت کو جاننا ضروری ہے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ امین احسن مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بجنور میں ملازمت تو کر رہے تھے، لیکن ان کا دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ یہ دل کہاں اٹکا ہوا تھا؟ اس کا جواب ہمیں اس خط سے ملتا ہے جو انھوں نے 13 جنوری 1924 میں اپنے استاد امام حمید الدین فراہی کو لکھا۔ یہ خط ملاحظہ فرمائیں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ آج صبح موصول ہوا۔ اس کا جواب بذریعہ ارجنٹ تار بھیج چکا ہوں۔ غالباً موصول ہو چکا ہو گا۔

میں حسب ارشاد فوراً امتثال امر کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن صورت ایسی پیش آگئی کہ حضور کے جواب کا انتظار کرنا پڑا۔ میں ان دنوں ''مدینہ'' اور تراجم سے زیادہ قرآن مجید کے مشاغل میں مصروف ہوں۔ اور بغیر کسی قائم مقام کے میرا یہاں سے ٹلنا از بس دشوار ہے۔ اگر میں اپنے ملنے والوں میں سے اپنا کوئی قائم مقام دے سکوں تو مجھے با آسانی چھٹی مل سکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ فی الحال میرے لیے یہ ناممکن ہے، احباب مدرسہ میں سے شاید کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہو گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ میں مستقل طور پر علیحدہ ہو جاؤں اور اپنے بجائے کسی اور کو اپنے فرائض سپرد کر دوں۔ میں ذاتی طور پر اس کے لیے مستعد اور بخوشی مستعد ہوں بشرطیکہ حضور اس کی اجازت دیں۔ میرے لیے ملازمت کی پاس داری باعث ندامت ہے۔ میں جناب والا کے حکم اور مدرسہ

کی خدمت کے لیے اپنے تمام مصالح دنیوی کو خیر باد کہہ سکتا ہوں۔ مینیجر صاحب موجودہ حالات میں میری غیر حاضری اپنے مصالح کے لیے غیر مفید سمجھتے ہیں۔ اور رنگون و کلکتہ سے صرف ایک ماہ میں میری واپسی قطعی ناممکن تصور کرتے ہیں۔ پھر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں اپنے آپ کو حضور کی مرضی کے سپرد کر دوں۔

میری مرضی یہی ہے کہ اس سفر میں مجھے جناب کی معیت و خدمت کا شرف حاصل ہو۔ میرے لیے یہ باعث صد خیر و برکت ہے۔ جواب کا منتظر ہوں، قطعی فیصلہ سے مطلع فرمایئے، خادم بہر صورت تیار ہے۔ والسلام

آپ کا خادم

امین

یہ خط امین احسن نے جس مراسلے کے جواب میں لکھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مدرسۃ الاصلاح میں مالی مشکلات درپیش تھیں۔ یہ جنگ عظیم اول کے بعد کا زمانہ تھا۔ اس کی وجہ سے ایک عالمگیر بحران تھا۔ اس موقع پر مدرسے کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ برما (موجودہ نام میانمار) میں وسائل کے حصول کے لیے ایک وفد بھیجا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ اس میں امام فراہی کے ساتھ ان ہی کی صوابدید کے مطابق امین احسن کا نام بھی شامل تھا۔ چنانچہ انھیں امام فراہی نے اس وفد میں شامل ہونے کے لیے خط لکھا۔ امین احسن کا انتخاب اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ اپنے استاذ کی نگاہ میں بہت اہم تھے اور ان سے انھیں مدرسے کی ترقی کے لیے کس قدر نیک توقعات تھیں۔ ایک دوسرے ملک کے سفر میں بطور ہمراہی ان کا انتخاب استاد اور شاگرد کے مزاج کی ہم آہنگی کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

جیسا کہ جواب سے واضح ہے کہ امین احسن نے اسی دن اس خط کا جواب تار کے ذریعے سے دیا اور اس میں پر جوش طریقے سے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا اور اطلاع دی ہوگی کہ وہ ابھی اخبار کی انتظامیہ کو مہینے بھر کی چھٹی کی درخواست دیں گے۔ اگر درخواست قبول نہ ہوئی تو انھوں نے نوکری ختم کر کے اعظم گڑھ آنے کی اجازت مانگی ہوگی۔ جب ان کے اس تار کا کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے یہ خط لکھا۔

اس خط سے انھوں نے یہ خبر دی کہ چھٹی کی منظوری بوجوہ نہیں ملی، اس لیے انھیں نوکری

سے استعفے کی اجازت دی جائے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اخبار میں نوجوان امین احسن پر کس قدر انحصار کیا جاتا تھا۔ اور ان کے مقابل کا کوئی فرد بھی دستیاب نہیں تھا۔ امام فراہی کے حوالے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امین احسن کو کسی مشکل میں نہیں ڈالا اور انھیں نوکری کو خیر باد نہ کہنے کا پیغام پہنچایا ہو گا۔ چنانچہ ڈاکٹر شرف الدین بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مقامی زمین دار حاجی حسن علی اور کسی دوسرے طالب علم کے ساتھ برما کی طرف روانہ ہو گئے۔

خط کے مندرجات سے یہ بھی عیاں ہے کہ امین احسن کا قرآن مجید سے بھرپور تعلق قائم تھا۔ یقیناً یہ ربط دوسری جگہ ملازمت کے دوران میں بھی قائم رہا ہو گا۔ اس خط میں امین احسن کا قرآن کے ساتھ تعلق کا بیان، ملازمت سے یک گونہ بیزاری اور مدرسے کی وابستگی کی شدید خواہش بھی ابلی پڑ رہی ہے۔ یہ وہ پس منظر ہے جو انھیں زندگی کے ایک اہم موڑ پر لے آیا۔

امام فراہی کی پیش کش

جب امین احسن ہفت روزہ ''سچ'' میں کام کر رہے تھے تو وہ کسی کام کے سلسلے میں اعظم گڑھ مدرسے میں گئے۔ وہیں ان سے امام فراہی نے پوچھا:

''امین اخبار نویسی ہی کرتے پھرو گے یا ہم سے قرآن پڑھو گے؟''

اس تاریخی سوال کا جواب انھوں کیا دیا، یہ ہم استاد محترم جناب جاوید احمد غامدی ہی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''1925ء میں امام فراہی نے اپنے گھر کے کسی گوشے میں کھڑے ہوئے اُن سے کہا تھا: امین احسن اخبار نویسی کرتے پھرو گے یا ہم سے قرآن پڑھو گے؟ وہ بتاتے تھے کہ میں اُس زمانے میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اچھے مشاہرے پر کام کر رہا تھا، لیکن میں نے بغیر کسی توقف کے عرض کیا: میں آپ سے قرآن پڑھوں گا۔ امام فراہی نے اپنی اقامت گاہ ہی کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: آپ یہاں ٹھیریں گے، اور میں ادارت سے استعفا دے کر ایک مرتبہ پھر طالب علمانہ زندگی گزارنے کے لیے اُس کمرے میں آ کر ٹھیر گیا۔ بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کسی کالج میں پروفیسری کے لیے اُن کا نام تجویز کیا اور کالج کے ذمہ داروں سے ہامی بھر لی کہ وہ اُنھیں راضی کر لیں گے۔ امین احسن کو بتایا گیا تو وہ چلچلاتی دھوپ میں

پیدل چلتے ہوئے دارالمصنفین پہنچے اور سید صاحب سے عرض کیا: آپ نے اِس فقیر کا نام تجویز کیا، آپ کا شکریہ، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ پیش کش قبول نہ کر سکوں گا۔ امام فراہی کو میں اُن کی زندگی میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ بتاتے تھے کہ سید صاحب بالکل حیران رہ گئے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک غریب طالب علم اتنی بڑی پیش کش اِس طرح ٹھکرا دے گا۔ بعد میں اُنھوں نے ندوہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ اِس واقعے کا ذکر کیا اور طلبہ سے کہا کہ دیکھو، طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال میں یہ بات کہہ کر چلا آیا، لیکن مجھے اندیشہ رہا کہ استاذ امام اِن دنوں اگر ''دارالمصنفین'' آئے تو ہو سکتا ہے کہ سید صاحب اُن سے بات کریں اور وہ مجھے بھیج دینے کا وعدہ کر لیں۔ اُن کا چہرہ ایک عجیب احساس فخر سے تمتما اٹھتا تھا، جب وہ یہ بتاتے تھے کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ استاذ امام وہاں گئے بھی اور سید صاحب نے اُن سے بات بھی کی، لیکن اُنھوں نے صاف کہہ دیا: آپ امین احسن کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں یہ ساری محنت آخر کس کے لیے کر رہا ہوں؟''

(اشراق، جنوری، فروری 1998)

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

ہم سفر

مقامِ شرحِ جنوں پر وہی سرور و حضور
نفس نفس وہی تنہا سرودِ نیم شبی
مری نگاہ سرابوں کی آرزو کا وجود
کہاں سے آئے ندیموں میں ذوقِ تشنہ لبی!

اِسی خطا پہ گریزاں ہیں ہم سفر میرے
کہ میری طبعِ رواں مصلحت شناس نہیں
وہ ہم سفر کہ زمانے میں جن کی دھوم ہوئی
مثالِ ماہ تھی تیرہ شبوں میں جن کی جبیں

مرے وجود میں پنہاں وجود کا حاصل
زبانِ شعر میں اپنے معلقات کہوں
مری نواؤں سے اب وہ بھی آشنا نہ رہے
مرے ندیم، میں شہرِ جنوں میں تنہا ہوں

مجھے رفیقِ صبوحی کی جستجو ہی رہی
مرے سبو کی حقیقت تہِ سبو ہی رہی

سید منظور الحسن

مسلمان کے چھ حقوق

[ترمذی کی روایت، رقم 2736 سے ماخوذ]

ترمذی میں بیاں روایت ہے
حسنِ اخلاق کی ہدایت ہے
قول یہ حضرتِ علیؓ کا ہے
کتنا اچھا سبق نبیؐ کا ہے
ایک دن مصطفیٰؐ نے فرمایا
اہلِ ایمان کو یہ سمجھایا:
ہر مسلماں کے ہر مسلماں پہ
یاد کر لو اِنھیں، حقوق ہیں چھ
ہر گھڑی اِن کا تم دھیان کرو
اپنے احباب میں بیان کرو
پہلا حق ہے سلام کہنے کا
بغض و نفرت سے دور رہنے کا
جب مسلماں ملے، سلام کہو

خلق و اخلاص کا پیام کہو
دوسرا حق قبولِ دعوت ہے
باہمی میل جول رحمت ہے
جب مسلماں بلائے کھانے پر
عذر و انکار ہو بھلا کیونکر
تیسرا حق دعائے رحمت ہے
کوئی چھینکے تو اُس کی قسمت ہے
چھینک آئے، خدا کی حمد پڑھو
کوئی چھینکے، دعائے رحم کرو
چوتھا حق درد و غم میں شرکت ہے
اِس کی ہر شخص کو ضرورت ہے
جب مسلمان کوئی ہو بیمار
جب مصائب کی اُس پہ ہو یلغار
لازماً پہنچو تم عیادت کو
اور بنا لو شعار خدمت کو
پانچواں حق سبھی پہ غالب ہے
ہر مسلمان اِس کا طالب ہے
جب مسلماں جہاں سے رخصت ہو
گر ہو ممکن جنازہ اُس کا پڑھو
مغفرت کی دعائیں دو اُس کو
اپنے ہاتھوں سے اُس کو دفن کرو
حق چھٹا قربتیں بڑھاتا ہے
ظرفِ انساں کو آزماتا ہے
جو کچھ اپنے لیے پسند کرو

اپنے بھائی کو بھی وہی کچھ دو
دین نے قربتیں بڑھائی ہیں
سب مسلمان بھائی بھائی ہیں

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[جنوری 2024]

المورد، امریکہ کا سالانہ اجلاس

گذشتہ ماہ ڈیلس میں المورد، امریکہ کے اراکین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ اجلاس تین روز تک جاری رہا اور اس میں امریکہ کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔ اِس موقع پر بیرون ملک مقیم ادارے سے وابستہ اہل علم کو بھی دعوت دی گئی۔ پاکستان سے ڈاکٹر شہزاد سلیم اور ڈاکٹر عمار خان ناصر اور ملائشیا سے سید منظور الحسن مختلف سیشنز میں شریک ہوئے اور علمی اور دعوتی موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ المورد، یو ایس کے سیکرٹری علی فاروق صاحب نے چیئرمین المورد بورڈ جناب مکرم عزیز کو مرکزی اجلاس کے آغاز کے افتتاحی خطاب کی دعوت دی۔ اُنھوں نے بورڈ کی طرف سے شرکا کو خوش آمدید کہا اور اپنی اور بورڈ کی جانب سے ادارے کی تعمیر و ترقی کے لیے بھرپور کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ جناب مکرم عزیز صاحب چونکہ شہزاد مرزا صاحب کے ساتھ مل کر ادارے کے مالی معاملات کو بھی دیکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے سال 2023 کے مالی امور کے حوالے سے تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔ المورد یو ایس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اور سی ای او جناب فرحان سید نے ادارے کی سالانہ کارکردگی رپورٹ پیش

کی۔ شرکا نے کارکردگی کو سراہا اور کہا کہ محدود ٹیم کے ساتھ غیر معمولی کام انجام دینا لائق تحسین ہے۔ اس کے بعد ایجوکیشن کمیٹی کے ممبران جناب عاطف ساجد، جناب نائف پاشا اور جناب فراز احمد نے ''سنڈے اسکول'' اور آن لائن لرننگ پلیٹ فام کے حوالے سے تعلیمی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ جناب عمیر اجمل، جناب ارتضیٰ اجمل، جناب قرب زیدی اور اجمل تارڑ صاحب نے ڈیجیٹل کانٹینٹ، پوسٹ پروڈکشن، ڈبنگ اور سوشل میڈیا کے حوالے گذشتہ برس سرانجام دی جانے والی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے ڈائریکٹر محمد حسن الیاس صاحب نے ادارے کے مقاصد واہداف اور لائحۂ عمل کو چار نکات کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ محض غامدی صاحب کی فکر کا نہیں، بلکہ پورے دبستان شبلی کا نمایندہ ادارہ ہے۔ اس لیے دبستان شبلی کے تمام علما کا کام دنیا کے سامنے لانا بھی اس ادارے کے مقاصد میں شامل ہے۔ دوسرے یہ کہ ہماری فکر کے تمام اہل علم کو ادارے کے ہر کام اور منصوبے میں اصل کی حیثیت دیتے ہوئے ان کی رہنمائی میں ہر کام سرانجام دینا ہے۔ تیسرے، ایسے موضوعات کو زیر بحث لانا جو غامدی صاحب کے پورے کے پورے استدلال کی تعلیم کا باعث بنیں۔ اور چوتھے، غامدی صاحب کے تیارہ کردہ علمی افراد کو اجتماعی بصیرت میں ڈھال کر اداروں میں شامل کرنا ہے تاکہ ادارے ان کو اس طرح تیار کریں کہ مستقبل میں وہ قیادت کے منصب پر فائز ہو سکیں۔

سید منظور الحسن نے ولولہ انگیز خطاب کیا۔ انھوں نے المورد یو ایس کے کام کو المورد کی دعوت کی تجدید سے تعبیر کیا اور اپنے 30 سالہ تجربات کی روشنی میں بتایا کہ المورد یو ایس کے کام نے ہماری دعوتی جدوجہد میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم نے موجودہ دور میں انگریزی زبان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ ابلاغ کے جدید ذرائع کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہر سطح پر غامدی صاحب کی فکر کا ابلاغ انگریزی زبان میں بھی کیا جائے۔ اس حوالے سے انھوں نے غامدی سینٹر کے زیر اہتمام انگریزی میں ہونے والے مختلف منصوبوں کا تعارف بھی کرایا۔

ڈاکٹر عمار خان ناصر نے فکر غامدی کے علمی اور دعوتی نتائج کے حوالے سے اپنے احساسات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ فکر غامدی نے دین کی اصل روح کے ساتھ جڑنے کے بہت سے اہم اور

غیر معمولی اسباب پیدا کیے ہیں۔

جناب جاوید احمد غامدی نے المورد کے اہداف و مقاصد بیان کیے۔ اُنھوں نے المورد امریکہ کے تمام علمی اور انتظامی افراد کو نصیحت کی کہ وہ دعوتی کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاقی رویوں کا بھی جائزہ لیتے رہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو ہمیشہ زندہ رکھیں۔

اجلاس کے بعد عشائیے کا انتظام بھی کیا گیا تھا، جس میں المورد، یو ایس کے اراکین اور باقی احباب شریک ہوئے۔ اس کے بعد ایک ورکشاپ کا انعقاد ہوا جس میں المورد یو ایس کے اراکین، خصوصی مہمانوں اور المورد، یو ایس کے ریسرچ اسکالر نے شرکت کی اور مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ہفتہ وار درس قرآن و حدیث

دسمبر 2023 میں غامدی صاحب کے لائیو درس قرآن و حدیث میں درس قرآن کی 8 نشستیں منعقد ہوئیں جن میں سورۂ نحل کو مکمل کیا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی 3 آیات کا درس دیا گیا۔ درس حدیث کی 8 نشستوں میں ”اتمام حجت اور عذاب“ اور ”انسان کی تخلیق کا عمل اور علم الٰہی“ کے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

”راز حیات“

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے ریسرچ اسکالر منظور الحسن صاحب کا ”راز حیات“ کے عنوان سے پروگرام کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ ماہ اس پروگرام میں منظور الحسن صاحب نے اپنے بچپن کے اس خواب کو تفصیل سے بیان کیا جس میں وہ ایک تقریب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرتے ہیں۔ اپنے اس خواب کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ میں نے خواب میں جس شخصیت کو دیکھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں، اس لیے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ”جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی خواب میں دیکھا“ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث کا تعلق دراصل صحابۂ کرام سے ہے۔

”غامدی صاحب سے ہمارا اختلاف“

یہ مضمون اس سوال کے جواب میں ہے جو حسن الیاس صاحب سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو غامدی صاحب کی کسی رائے سے اختلاف بھی ہوتا ہے؟ وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ غامدی صاحب کی فکر کے مقلدِ محض نہیں ہیں اور نہ ہی انھوں نے غامدی صاحب کی فکر یا رائے کو بغیر سوچے سمجھے اور روایتی فکر سے تقابل کیے بغیر اپنایا ہے، بلکہ عقل و شعور کی روشنی اور تقابلی طریقے پر غامدی صاحب کے زاویۂ نظر کو سمجھنے میں برسوں کا علمی سفر طے کیا تب جا کر اس کے اصولی مقدمات واضح ہوئے اور ان سے اتفاق پیدا ہوا۔ یہ مضمون ماہ دسمبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

”قرآن و سنت کا باہمی تعلق“ کی آڈیو بک

یہ ڈاکٹر عمار خان ناصر کی تصنیف ہے۔ انھوں نے گذشتہ ماہ امریکہ میں اپنے قیام کے دوران میں غامدی سینٹر کے اسٹوڈیو میں اس کتاب کی آڈیو ریکارڈنگ کرائی ہے۔ جلد ہی یہ کتاب آڈیو کی صورت میں سلسلہ وار غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر کی جائے گی۔

”حدیث کیا ہے؟“ پر اشکالات و اعتراضات کا جائزہ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ”حدیث کیا ہے؟“ کا موضوع زیر بحث ہے۔ دسمبر 2023 میں اس سیریز میں حدیث کے حوالے سے غامدی صاحب کے موقف پر پیش کیے جانے والے اشکالات اور اعتراضات کا جائزہ لایا گیا۔ مزید برآں یہ سوال بھی زیر بحث رہا کہ کیا دین کی شرح و وضاحت نبی کریم ﷺ کی منصبی ذمہ داری تھی؟ اس ضمن میں سورۂ جمعہ کی آیت 2 پر گفتگو کرتے ہوئے ’الکتاب‘ اور ’الحکمۃ‘ کے معنی کو بھی کھولا گیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

”درس نظامی“ پر تبصرے کی وضاحت

گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کے زیر اہتمام سوال و جواب کی ہفتہ وار نشست میں درس نظامی پر غامدی صاحب کے ایک تبصرے کے حوالے سے بحث چل رہی ہے۔ اس میں درس نظامی کے بارے میں غامدی صاحب کے اصولی نقطۂ نظر کو بیان کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں درس نظامی پر غامدی صاحب

کے لکھے گئے مضمون کے اہم اقتباسات کو بھی زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ ماہ دسمبر میں اس موضوع پر 4 نشستیں ہوئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

''البیان'' اور ''میزان'' کے انگریزی زبان میں لیکچرز

غامدی صاحب کی تفسیر قرآن ''البیان'' اور اسلام پر ان کی کتاب ''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ پچھلے ماہ ''البیان'' کی 2 نشستوں کا انعقاد ہوا، جن میں سورۂ بقرہ کی آیات 163 تا 203 زیر بحث آئیں۔ ''میزان'' سیریز کے تحت ''The Social Shariah'' کے عنوان سے ڈاکٹر شہزاد سلیم نے دو لیکچرز ریکارڈ کیے۔ یہ لیکچرز غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

''یہود اور خدا کا فیصلہ''

اس مضمون میں خورشید ندیم صاحب نے اسرائیل کے اس خوف کو بیان کیا ہے جس کی وجہ سے وہ فلسطین پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے یہود کی تاریخ، ان کے جرائم اور اسرائیل کے قیام کی تاریخ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اگرچہ اسرائیل کی ریاست قائم ہو گئی، لیکن وہ آج بھی بقا کے خوف میں مبتلا ہیں۔ امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسرائیل کی ریاست قائم کی اور اس کے وجود اور بقا کا مکمل انحصار امریکہ پر ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کو یہ خوف مسلسل لاحق رہتا ہے کہ امریکہ میں کوئی ایسی حکومت قائم نہ ہو جائے جو اسرائیل کے مخالف ہو، اس لیے وہ امریکہ میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لیے اربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ یہ مضمون ''اشراق، امریکہ'' کے دسمبر کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

''جسمانی سزا اور تشدد پسندی کی نفسیات''

اس مضمون میں مصنف نے ہمارے معاشرے میں تشدد پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی مذمت کرتے ہوئے اس کے نقصانات، بچوں کی نفسیات پر اس کے منفی اثرات اور اس کی روک تھام کے لیے لائحۂ عمل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ بچوں پر تشدد ایک بھیانک عمل ہے جس کے نتائج فرد

اور خاندان سمیت پورے معاشرے کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ تشدد سے تربیت پانے والے بچوں میں ڈر، عدم تحفظ، منافقت اور بدتمیزی جیسی خصلتیں جنم لیتی ہیں۔ مزید برآں انھوں نے اس مضمون میں تشدد برائے تادیب کا جواز پیش کرنے والی روایت کی سند کے حوالے سے محدثین کے اعتراضات بھی نقل کیے ہیں۔ دسمبر 2023 کے شمارے میں یہ مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

گذشتہ ماہ دنیا نیوز پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام کے موضوعات ''فروغ تعلیم کے نئے امکانات''، ''عدت میں نکاح اور ''سوال و جواب'' تھے۔ ان پروگراموں میں لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے متفرق سوالوں کے جوابات کے ساتھ ساتھ عدت کے احکام، عدت میں نکاح کرنے کا کفارہ، مخیر حضرات کا قومی تعمیر کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنا اور لوگوں کو مفت تعلیم فراہم کرنے جیسے اہم ایشوز کو موضوع بحث بنایا گیا۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''نیا لباس''

''اشراق، امریکہ'' کے دسمبر 2023 کے شمارے میں فضائل اخلاق پر مبنی ترمذی کی حدیث، رقم 305 کو نظم کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ''نیا لباس'' ہے، جس میں نیا لباس پہننے کے حوالے سے نبی کریمؐ کے اسوہ کا بیان ہے۔ اس نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

پیمبرؐ نے ہم سے یہ فرمایا اک دن
محبت سے، شفقت سے سمجھایا اک دن:
نیا کپڑا جب بھی پہننے لگو تم
تو تعریف اپنے خدا کی کرو تم

امین احسن اصلاحی کے دوران تعلیم کے واقعات

گذشتہ ماہ ''حیات امین'' کی چوتھی قسط میں نعیم بلوچ صاحب نے مولانا امین احسن اصلاحی کے

دوران تعلیم کے مختلف واقعات قلم بند کیے ہیں۔ ان واقعات میں سے ایک اہم واقعہ مدرسۃ الاصلاح کے سالانہ جلسے میں مولانا کا تقریر کرنا ہے، جس کی صدارت مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ مولانا فراہی نے اصلاحی صاحب کی تقریر کو بہت پسند کیا اور اپنے تفسیری مجموعے کے ایک سیٹ پر اپنے دستخط کر کے اصلاحی صاحب کو عنایت کیا۔ اردو پڑھنے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اساتذہ نے مولانا اصلاحی کو اردو کا پیدایشی عالم قرار دیتے ہوئے اردو سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ یہ مضمون دسمبر 2023 کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

ڈاکٹر شہزاد سلیم ہر ماہ لوگوں کے ساتھ آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں جن میں لوگ اپنے ذاتی اور خاندانی مسائل کے حل کے لیے شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ بھی ڈاکٹر شہزاد سلیم نے مختلف لوگوں کے ساتھ متعدد آن لائن پرائیویٹ سیشن کیے، جن میں لوگوں نے آپ سے والدین کو درپیش مشکلات اور نو عمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

کیا مورگیج پر گھر لینا جائز ہے؟

حسن الیاس صاحب سے سوال و جواب کی ایک نشست میں پوچھا گیا کہ کیا مورگیج پر گھر لینا جائز ہے یا ناجائز؟ حسن الیاس صاحب نے کہا کہ اگر اس معاملے کو اس کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ جائز ہے اور سود کے زمرے میں نہیں آتا کیونکہ سود کسی شخص سے قرض پر متعین نفع لینا ہے۔ جبکہ اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس کی بنیاد پر اسے سود یا ناجائز قرار دیا جا سکے۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 5

فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں محمد حسن الیاس نے جاری کیا۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم کے مختلف لیکچرز کی ریکارڈنگ

دسمبر 2023 میں شہزاد سلیم صاحب نے ”الحاد اور اندھی تقلید کے چیلنجز“ اور ”انسانیت“ کے موضوعات پر لیکچر ریکارڈ کرائے۔ اور Lessons of Life Series کے زیر عنوان انگریزی زبان میں 4 لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان کے موضوعات یہ ہیں: ”آیئے ہارنے سے انکار کریں“، ”اپنی پرہیز گاری کا مرض“، ”ایک بڑی آلودگی“ اور ”دنیا کے شہری“۔ یہ لیکچرز غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔